

حالم (نمرہ احمد)

باب پنجم:

”تین خزیںوں کا مسکن“

اس نے خواب میں دیکھا....

وہ ایک دالان میں کھڑی ہے.... سرخ اینٹوں والا کھلا سامن.... ہر اٹھا کے سامنے دیکھتی ہے تین اطراف میں کمرے ہیں۔ ایک کھڑی کا دو منزلہ گھر.... جیسے پرانے لاہور کے بازار میں بنی پرانی حویلیاں.... بالائی منزل کے کمروں کے آگے بالکونیاں کھلتی ہیں جن میں گملے رکھے ہیں.... صحن کے ایک کونے میں ایک گول چبوترہ بنا ہے جس پہ ایک مجسمہ نصب ہے.... چغہ پہنے کھڑے آدمی کا مجسمہ جس کی میان میں تلوار ہے....

وہ خواب کی کیفیت میں قدم اٹھاتی ہے.... آگے چلتی جاتی ہے....

مجسمے کے پیچھے.... وہ اس قلعے اور حویلی نما گھر کی دیوار کے پاس وہ آرکتی ہے.... دیوار کے ایک کونے میں الفاظ کھدے نظر آتے ہیں....

جیسے گیلے گارے اور سیمنٹ میں کسی نے کھود کھود کے لکھا ہو....

وہ الفاظ چمک رہے ہیں....

”تاشہ“

جوشنِ ادیبوں جیسی تھی....

اور جس نے ایک غلام سے شادی کی تھی....“

نیچے ایک طویل نظم لکھی ہے جو دھندلی سی ہے.... وہ ان الفاظ پہ ہاتھ پھیرتی ہے....

پھر آوازیں سنائی دیتی ہیں.... اس کی اپنی آواز... سکوں کی کھنک کے درمیان....

”ایک دن ایڈم.... میں اور تم.... اس گھر میں دفن خزانہ ڈھونڈنے آئیں گے۔“

وہ چونک کے گردن گھماتی ہے.... گھر تنہا ویران پڑا ہے.... وہاں کوئی نہیں ہے، مگر یوں لگتا ہے گویا درود دیوار بول رہے

ہیں... جیسے یادیں آواز کی صورت سنائی دے رہی ہیں....

”اس گھر میں خزانہ؟ سن باؤ کے گھر میں؟ مگر چے تالیہ....“

”اؤںہوں.... اس کے اندر نہیں.... اس کے نیچے ہے خزانہ.... ہمیں نیچے جانا ہوگا۔“

ایک جھٹکے سے تالیہ کی آنکھ کھلی۔

وہ اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں چت لیٹی تھی۔ چونک کے وہ اٹھ بیٹھی۔

”خزانہ ہے....“ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سارے وجود میں خوشگوار سی بے یقینی پھیل گئی تھی۔ ”خزانہ واقعی ہے اور

صرف میں جانتی ہوں کہ وہ کدھر ہے۔ سن باؤ کا گھر۔“

وہ نیچے اتری.... سیلیپر زپیروں میں اڑ سے اور باہر بھاگی۔

نیچے آئی تو داتن کچن میں کام کر رہی تھی۔ پین کیک کی خوشبو.... تازہ مشروم کا آلیٹ.... خستہ کری پفز کی مہک.... وہ اہتمام سے

ناشتہ کر رہی تھی۔ یقیناً اپنے لئے کیونکہ جانتی تھی تالیہ یہ سب نہیں کھاتی۔

”داتن.... میری کالی موٹی براؤن مرغی....“ وہ خوشی سے چیختی سیڑھیاں اترتی بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی اور کندھوں سے تھام

کے اسے اپنی طرف گھمایا۔ داتن کے ہاتھ سے کفگیر گر گیا۔ وہ بوکھلا گئی۔

”کیا ہم پکڑے گئے تالیہ؟“

”داتن.... داتن....“ وہ اتنی خوش تھی کہ موٹی کی بات سنی بھی نہیں۔ ”داتن.... خزانہ ہے.... سن باؤ کے گھر میں.... میں نے خود

دیکھا ہے....“

داتن نے پہلے الجھ کے اسے دیکھا پھر.... اس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ سمجھ کے گہری سانس لی۔ ”خواب میں نا؟“

”میرے خواب جھوٹے نہیں ہوتے۔ وہ سن باؤ کا گھر ہے۔ تین نگینوں کا گھر.... تین خزانوں کا گھر۔“

”اور کہاں ہے وہ گھر؟“ وہ سنجیدگی سے تالیہ کا خوشی سے متمایا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”ملا کہ میں ایک ہی تو گھر ہے جس کو سن باؤ کا گھر کہتے ہیں۔ وانگ لی کا گھر۔ جو وان فاتح کی ملکیت ہے۔ اور میں نے کل سنا

وہ اس کو بیچنا چاہ رہا ہے۔“ وہ خوشی سے گلابی پڑتی بتا رہی تھی۔

”تالیہ.... مجھے تم سے بات کرنی ہے اور تمہارے خوابوں پہ پانی پھیرنا ہے۔“ داتن نے آہستہ سے کہا۔

”چونکہ میں امیر ہونے والی ہوں اس لیے تمہاری کسی بدگوئی کا برا نہیں مناؤں گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے کچن کے وسط میں اپنی

ایڑیوں پہ گول گول گھومی۔ جیسے کوئی ان سنی دھن بج رہی ہو اور وہ اس پہ رقص کر رہی ہو۔

”لنکادی... میں لنکادی میں ایک پووووورا جزیرہ خریدوں گی... پھر میں اس پہ ایک اونچا قلعہ بناؤں گی...“ وہ مہارت سے گول گول گھومتی ایک کونے سے دوسرے پہ جارہی تھی جیسے برف کے اوپر اسکیٹنگ کر رہی ہو۔

”تالیہ... کوئی خزانہ نہیں ہے۔“ داتن نے اسے افسوس سے دیکھا۔

”ایک دفعہ پھر کہو یہ بات موٹی اور تمہیں میں اپنے محل کا سب سے چھوٹا کمرہ دوں گی۔“ اس کے پیر برق رفتاری سے گھوم رہے تھے اور وہ لٹو کی طرح آگے سیڑھیوں تک جارہی تھی۔

”تالیہ... وہ چابی ملعون ہے۔“

”اب تمہیں سرونٹ کو ارٹڑ ملے گا!“ وہ گھومتے گھومتے رکی... چہرے سے سنہری بال ہٹائے اور لا پرواہی سے کہہ کے سیڑھیاں چڑھتی گئی۔ داتن بے بسی سے واپس چولہے کی طرف پلٹ گئی۔

چند منٹ بعد وہ واپس آئی تو بال فرنیچر چوٹی میں بندھے تھے۔ زرد گھٹنوں تک آتے فراک اور ٹراؤزر میں ملبوس اور پرسفید منی کوٹ پہنے وہ ہلکے میک اپ میں تیار لگ رہی تھی۔

داتن کچن کی گول میز پہ لوازمات چنے بیٹھی تھی۔ وہ عجلت میں قریب آئی اور کرسی کھینچی۔ کری پلنر کی خوشبو... بین کیک کی تازگی... ساری فضا معطر ہو چکی تھی... تالیہ نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس اندر اتاری۔

”جانتی ہو میں یہ سب نہیں کھاتی، پھر کیوں بناتی ہو میرے لیے؟“

”کس نے کہا تمہارے لیے بنایا ہے؟ ہونہہ!“ داتن نے برا مان کے ایک پلیٹ اس کی طرف کھسکائی جس میں جوس کا ایک گلاس اور سیب رکھا تھا۔ تالیہ گہری سانس لے کے بیٹھی۔

”ابھی بھی وقت ہے داتن۔ اپنے وزن کی فکر کرو۔ عورتوں کو فٹ رہنے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ موٹا پاموت ہے۔ فٹ رہنا صحت ہے۔“

”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ داتن نے پلیٹ بھر رکھی تھی مگر کچھ بھی چھوئے بغیر سنجیدگی سے تمہید باندھی۔

”جلدی کرو کیونکہ عصرہ کا میسج آیا ہے۔ انہوں نے آج جلدی بلوایا ہے۔ پینٹنگ آج مکمل کرنی ہے۔“ وہ سیب میں دانت گاڑتے ہوئے بولی۔

”یہ کتاب۔“ داتن نے ایک کتاب اٹھا کے دکھائی تو سیب کا ٹکڑا چباتے تالیہ نے آنکھوں کی پتلیاں سکوڑیں۔ ”ہم شکار باز“

”یہ کتاب میں نے پڑھ لی ہے۔ اور میں اندازہ کر سکتی ہوں کہ تمہارے باپا اور تمہارا سارا خاندان... سب ختم ہو چکا ہے۔ نہ تمہارا گاؤں اب وہاں ہے۔ نہ کوئی خزانہ تمہاری راہ دیکھ رہا ہے۔ آرام سے سنو تالیہ... میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تم کہاں سے آئی تھیں

اور کیوں آئی تھیں۔“ داتن نے اپنا بھاری ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھا جو بالکل ٹھہر گئی تھی....
گھڑی کی سوئیاں آگے چلتی رہیں۔ داتن پدوکا بوتلی رہی۔ تالیہ سنتی رہی۔ درمیان میں چند ایک سوال اس نے پوچھے۔ آخر میں داتن بولی۔ ”میں جانتی ہوں یہ سب تمہارے لئے بہت اہم ہونا ہے اور تم شاید اس پہ یقین نہ کرو لیکن....“
اور تالیہ ایک دم کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

داتن کا منہ کھل گیا۔ تالیہ ہنوز گردن پیچھے کو پھینکے ہنستی جا رہی تھی۔ پھر سیدھی ہوئی اور محظوظ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔
”کیا دیو مالائی کہانیاں پڑھتی رہتی ہو تم داتن۔ ایسا کچھ نہیں ہوتا حقیقی دنیا میں۔ ہٹو بھئی۔“
”اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے تالیہ۔ جو قفل اس چابی سے کھلے گا اس کے پیچھے کوئی خزانہ نہیں ہوگا۔ بلکہ....“
”مجھے دیر ہو رہی ہے۔ عصرہ نے جلدی آنے کا کہا تھا۔“ وہ بے پرواہی سے سیب لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ داتن بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس بات پہ ماتھے پہ ہل پڑے۔ ”عصرہ نے ایسے جلدی میں کیوں بلوایا؟“
”پتہ نہیں۔ شاید کہیں جانا ہو۔“
”احتیاط کرنا عصرہ سے۔ کیونکہ سیاسی بیوی سیاستدان سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔“
”وہ کیسے؟“

”کیونکہ وہ واحد انسان ہوتی ہے جو ایک سیاستدان کو بھی con کر سکتی ہے۔“
تالیہ ہنس پڑی اور آگے بڑھ گئی۔ پھر دروازہ کھولتے ہوئے مڑ کے اسے دیکھا۔ ”سمجھ کا بندو بست کر لینا۔ میں نہیں چاہتی وہ روز میرے گھر آئے۔ اور کوشش کرنا کہ جب میں گھر آؤں تو میرا مہینے بھر کا راشن ختم نہ ہو چکا ہو۔“
داتن کے سامنے ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا تھا مگر اس کا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ بس بے دلی سے اس کتاب کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

محمود بن عزیزی کے خاندانی قلعے پہ صبح کی سفیدی پھیل رہی تھی۔ کھلے لان میں دو ہرن آگے پیچھے تلاخپیں بھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ برآمدے کے سامنے کار تیار کھڑی تھی۔ گویا مالک کا انتظار ہو رہا ہو۔
اندر آؤ تو اونچی چھت والے ڈائننگ ہال میں لمبی میز بچھی تھی۔ سربراہی کرسی پہ بیٹھا اشعر نیپکین سے ہاتھ پونچھتا، کافی کا آخری گھونٹ بھرتا اٹھ رہا تھا۔ سیاہ سوٹ اور بالوں کے سپانکس... وہ سنجیدہ اور مغرور لگ رہا تھا۔
”فائل کہاں ہے؟“ ساتھ کھڑے رملی سے پوچھا۔
”کار میں ہے۔ آپ باہر آئیں تو دیتا ہوں۔ آپ حفاظت سے کہیں رکھوا دیجئے گا۔“

”اور نیلامی کی تمام تیاریاں مکمل ہیں؟“

”جی سر۔ اب تو تھوڑے دن ہی رہ گئے ہیں۔“

”ہاں۔ وان فاتح کی بدنامی میں زیادہ وقت نہیں رہ گیا۔“ وہ تلخی سے مسکرایا اور موہاگل اٹھالیا۔ پھر پلٹا تو رملی کے چہرے پہ نظر پڑی۔ اشعر کے ابرو تشویش سے اکٹھے ہوئے۔ ”تمہاری شکل کیوں اتری ہوئی ہے؟“

رملی نے بے چارگی سے کندھے اچکائے۔ ”عثمان سے کیمرہ کھو گیا۔ بٹن کیمرہ جو میں نے اس کو دیا تھا۔“

اشعر محمود کے ماتھے پہ بل پڑے۔ آنکھوں میں غصہ ابھرا۔ ”واٹ؟ کیسے کھو گیا؟ اتنی اہم ویڈیو تھی اس میں۔“

”وہ کہتا ہے کہ جب پارٹی ختم ہوئی تو اس نے دیکھا، بٹن اس کے کوٹ پہ نہیں تھا۔ وہ خود حیران پریشان ہے کہ۔۔۔“

”جھوٹ بول رہا ہے وہ۔ کہاں جاسکتا ہے کیمرہ؟ اپنی قیمت بڑھا رہا ہے وہ بس۔ اس سے ویڈیو نکلاؤ جیسے بھی ہو۔“ تلخی سے کہہ کے وہ کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے باہر کی طرف بڑھ گیا۔

قلعے کا دروازہ کھولتے ہی خوبصورت سبزہ زار اور اس پہ قلائچیں بھرتے بے فکر سے ہرن نظر آئے۔ سبز گھاس.... جا بجا پھولوں کی کیاریاں.... ایک طرف بیٹھا مور.... مگر اشعر کو کچھ بھی حسین نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا سارا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

☆☆=====☆☆

صبح جیسے جیسے باسی ہوتی گئی، کوالا پور پہ آلودہ دھند سی چھاتی گئی۔ دور سمندر پار انڈونیشیا کا ملک واقع تھا۔ وہاں آج پھر کوئی جنگل جلایا گیا تھا اور فضا ملائیشیا تک آلودہ ہو گئی تھی۔

وان فاتح کے لاؤنج کی کھڑکی سے دھند میں ڈوبالان نظر آرہا تھا۔ عصرہ کھڑکی کے سامنے اونچی کرسی پہ بیٹھی تھی۔ مسکراتے ہوئے بت بنی۔ اور سامنے تالیہ ایزل پہ کیئوس سجائے، گردن ترچھی کیے پینٹ کرتی نظر آرہی تھی۔

لاؤنج میں خاموشی تھی۔ ایسے میں مجسمہ بنی عصرہ نگاہ بار بار اٹھا کے وال کلاک کو دیکھتی تھی۔

”آپ کا ملاکہ والا گھر.... کیا آپ لوگ اکثر وہاں جاتے ہیں؟ دراصل مجھے تاریخ بہت فیسی نیٹ کرتی ہے۔“ وہ سادگی سے پوچھ رہی تھی۔ عصرہ مسکرائی۔

”وہ عرصے سے بند پڑا ہے۔ کبھی کبھار چکر لگ جاتا ہے۔“

”اچھا میں نے کانگ ہو کو بھی آپ کی گیلری کی نیلامی پہ مدعو کیا ہے۔“ برش کیئوس پہ پھیرتے ہوئے تالیہ نے بات پلٹ دی۔

”کانگ ہو؟ وہ چائینیز آرٹسٹ؟“ عصرہ نے ستائش اور تعجب سے ابرو اٹھائی۔ تالیہ جھینپ کے مسکرائی۔

”چند برس پہلے میں نے پینٹنگ سیکھی تھی ایک آرٹ اسکول سے۔ وہ وہاں پڑھاتے تھے۔ اسی طرح میں ان کو جانتی ہوں۔“

آرٹ بنانے اور اس کو محفوظ رکھنے والے ہی ہوتے ہیں میرے سوشل سرکل میں۔“

”اچھا لگن کر۔ تم تو کافی کام کی لڑکی ہو۔ کیا کانگ ہو آئیں گے؟“

”کانگ ہونہ صرف آئیں گے بلکہ ان کو آپ کی گیلری سے تین نواردات بھی خریدنے ہیں۔“ وہ مگن انداز میں برش کر رہی تھی۔

”اچھا... کون سے نواردات میں دلچسپی دکھائی انہوں نے؟“

”انہوں نے مجھے لسٹ دی تھی۔ ٹھہریں میں دکھاتی ہوں۔“ برش کا کونا دانتوں میں دبایا اور ساتھ رکھا پرس اٹھایا۔ زپ کھولی۔

احتیاط سے تہہ شدہ کاغذ نکالا اور عصرہ کو جا کر دے آئی۔ پھر واپس کھڑی بے نیازی سے پیٹ کرنے لگی۔

”عثمانی سلطنت کا خطاطی کا اجازہ۔“ عصرہ کاغذ کھول کے پڑھ رہی تھی۔ ”بالکل۔ یہ نیلامی پہ ہوگا۔ اور یہ دسویں صدی کا شمالی

افریقہ کا قرآن کا نیلے رنگ کا نسخہ۔ یہ بھی میری کلیکشن میں ہے۔“ پھر وہ ٹھہر گئی۔ آنکھیں سکوڑ کے آخری تصویر دیکھی جو اس کاغذ پہ

چھپی تھی۔ (برش کرتی تالیہ کا دل زور سے دھڑکا۔)

”سنو تالیہ... میرے پاس مظفر شاہ کے زمانے کا تو کوئی سکہ نہیں ہے۔“ اچنبھے سے آنکھیں اٹھائیں تو تالیہ نے بظاہر چونک

کے اسے دیکھا۔

”پتہ نہیں عصرہ... انہوں نے کہا تھا کہ یہ مختلف سکہ ہے۔ اس کے دونوں طرف مظفر ال سلطان لکھا ہوا ہے اور یہ آپ کے ہی

پاس ہے۔“ وہ جیسے یاد کر کے بتا رہی تھی۔

”نہیں میرے پاس تو....“ عصرہ رکی پھر گہری سانس لی۔ ”اچھا وہ... وہ تو نقلی تھا۔ ایک فیملی فرینڈ نے لینڈنگ سمجھ کے دے دیا۔

مگر کانگ ہو کو کیسے معلوم کہ وہ میرے پاس ہوگا؟“

”جیسے مجھے معلوم ہے کہ ملا کہ سلطنت کی ایک ملکہ کی ہیر پن آپ کے پاس ہے مگر آپ اس کو بیچتی نہیں ہیں۔ کہیں سنبھال کے

رکھتی ہیں۔ آرٹ کلیکٹر ز کو سب معلوم ہوتا ہے کہ کون سے نواردات کس کے پاس ہیں مسز عصرہ۔“

اس کی بات پہ عصرہ کھلکھلا کے ہنس دی۔ ”ہاں۔ یہ درست کہا تم نے۔ میں بھی پوری خبر رکھتی ہوں۔ مگر یہ سکہ میرے پاس نہیں

ہے۔“

تالیہ نے بے فکری سے کندھے اچکا دیے۔ ”اگر آپ نہیں بیچنا چاہتیں تو انکار کر دیجیے گا اٹس اوکے۔“

”نہیں تالیہ.... یہ واقعی میرے پاس نہیں ہے۔ میں نے آگے دے دیا کیونکہ یہ سونے کا تھا مگر قدیم نہیں تھا۔ چند سال پرانا ہی

ہوگا۔“

تالیہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا مگر اس نے بدقت اپنے تاثرات کو نارمل رکھا۔ ”تو اگر وہ مجھ سے نئے مالک کا پوچھیں تو میں کیا

کہوں؟“

”ان کو بتانا کہ وہ سکہ fake تھا۔ ایڈم نے تو اب تک اس کو تڑوا کے جیولری بھی بنوالی ہوگی۔“ وہ رسان سے کہہ رہی تھی۔ نظریں گاہے بگاہے گھڑی کی طرف اٹھتی تھیں۔ مگر تالیہ کے قدموں تلے زمین سرکنے لگی۔

”ایڈم؟ آپ کا ملازم؟ تو وہ آپ نے اسے دے دیا؟“ ساری اداکاری بھول کے تیزی سے بولی۔

”ہاں۔ میں نے ایک تو لے سونے کا کیا کرنا تھا؟“

”جی‘ تو ہے!“ جلدی سے سنجل کے مسکرائی اور دوبارہ پینٹ کرنے لگی۔ البتہ دوسرے ہاتھ کی مٹھی بھینچ لی تھی۔ دماغ کی چولیس تک بل گئی تھیں۔

”کتنی دیر ہے؟“ عصرہ نے پوچھا، پھر مسکرا کے خود ہی وضاحت دی۔ ”در اصل مجھے کہیں ضروری پہنچنا ہے۔“

”بس.... چند سیکنڈ مزید۔“ وہ آخری ٹچ دے رہی تھی۔ ذہن میں آندھیاں الگ چل رہی تھیں۔ عجیب گول منجھدار تھا جس میں وہ گھومتی جا رہی تھی۔ اب ایڈم سے کیسے نکلوائے سکے؟ اُف!

پینٹنگ مکمل ہوئی اور عصرہ فارغ ہو کے باہر آئی تو پورچ میں ملازمہ کھڑی تھی۔ وہ اس کے قریب رکی۔

”فاتح دس منٹ تک جاگنگ سے آجائے گا۔ وہ جس وقت آئے یہ لڑکی ڈرائیونگ روم میں بیٹھی ہوتا کہ اس کو سامنے نظر نہ آئے۔“

وہ اوپر اسٹڈی میں چلا جائے تو اس کو تالیہ کی آمد کی اطلاع کر دینا۔“ سنجیدگی سے کہہ کے سن گلاسز آنکھوں پہ چڑھائے۔ ”اور میری

پینٹنگ کو سنبھال رکھنا۔“ پھر آگے بڑھ گئی جہاں ڈرائیور کار کا پچھلا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ کسی ملکہ کی سی بے نیازی سے عصرہ کار میں

بیٹھی۔ لیوں پہ تلخ مسکراہٹ تھی۔ (بھری محفل میں کل یہ لڑکی بتا رہی تھی کہ میرا باپ چائے کی پتی کا کام کرتا تھا، ہونہہ۔)

تالیہ ہاتھ دھو کے باہر آئی تو ایزل سے پینٹنگ غائب تھی۔ ملازمہ اس کی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔

”میں نے پینٹنگ اوپر ڈرائی ہوئے رکھ دی ہے، آپ ناشتے کے لئے ادھر آجائیں۔ بیگم صاحبہ نے کہا ہے کہ اس کے بغیر میں

آپ کو نہ جانے دوں۔“

تالیہ نے اپنا پرس اٹھاتے ہوئے سرسری سی اطراف پہ نگاہ دوڑائی۔ ”ایڈم آگیا؟“

”وہ آنے والا ہوگا۔ آج دیر ہوگئی۔“ ملازمہ نے اسے ڈائیننگ ہال میں بٹھایا، پردے برابر کیے اور غائب ہوگئی۔ تالیہ اب جان

گئی تھی کہ سکہ گھر میں نہیں اس لیے ادھر ادھر پھرنے کے بجائے وہیں بیٹھی رہی۔ چند منٹ گزرے کہ ملازمہ دوبارہ نمودار ہوئی۔

”فاتح صاحب آپ کو اوپر اسٹڈی میں بلا رہے ہیں۔“

وہ عام سی بات تھی۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ مگر تالیہ مراد کا ہاتھ ٹھنکا۔ کچھ غلط تھا اس سب میں۔ جیسے تمام ملازم کسی

اسکرپٹ کو پڑھ رہے ہوں۔

وہ اٹھ کے سیدھی اوپر چلی آئی۔ تیز گہری نگاہیں گھما کے اطراف کو بھی دیکھتی تھی۔ جیسے کچھ سوگنھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

اسٹڈی کا دروازہ دستک دے کر دھکیلا تو منظر سا کھلتا چلا گیا۔ دیوار سے لگے کتابوں کے ریک... آبنوسی میز اور اس کے پیچھے ٹیک لگا کے بیٹھا وان فاتح راحزل۔ وہ سوٹ اور ٹائی میں ملبوس تھا۔ کہنی کرسی کے ہتھ پہ جمائے دو انگلیاں گال تلے رکھے فاتح اس کے اوپر آنکھیں جمائے ہوئے تھا۔

”آؤ!“ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ قدم قدم چلتی قریب آئی۔ کچھ اس کی شخصیت کا سحر تھا۔ کچھ خاموش ماحول تھا... ہر بڑھتا قدم اسے مرعوب کر رہا تھا۔ اس کے سامنے کرسی کھینچ کے بیٹھی۔ اب فاتح سامنے تھا اور اس کے پیچھے دھندلا شہر دکھاتی کھڑکی۔

”آپ نے مجھے بلایا، تو انکو۔“ وہ مسکرا کے گویا ہوئی۔ ہاتھ گود میں رکھ لیے اور پرس پیروں کے پاس۔

”تم نے کبھی Malay Annals پڑھے ہیں تالیہ؟ سارا جیوا ملایو؟“ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بولا تو تالیہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”سارا جیو ملایو؟ ملائیشیاء کی قدیم داستانوں کا مجموعہ جو کئی صدیاں پہلے لکھا گیا تھا آج بھی ہر ملے بچے کو بڑے ہوتے وقت پڑھایا جاتا ہے؟ میں نے اسے پڑھا نہیں ہے مگر اس کے بارے میں سنا بہت ہے۔“

”اس میں ایک کہانی ہانگ تو اکی ہے۔ وہ سلطان منصور شاہ کے پانچ جری سپاہیوں میں سے ایک تھا۔ سورما۔ بہادر۔ نڈر۔ بے حد طاقتور۔“ وہ اس پر سے نظریں ہٹائے بغیر بات جاری رکھے ہوئے تھا اور تالیہ پلکیں تک نہیں جھپک پارہی تھی۔

”ان پانچوں کو سلطان نے عظیم ہتھیاروں کی طرح تیار کیا تھا۔ ہانگ تو ان کا لیڈر تھا۔ سب سے طاقتور۔ مگر اس کی بڑھتی مقبولیت اس کے لیے مسائل پیدا کرنے لگی۔ لوگوں کو اس سے حسد ہونے لگا۔ یوں ایک دن سلطان کو غلط فہمی ہوئی کہ ہانگ تو انے حرم کا اصول توڑا ہے تو اس نے وزیر اعظم کو حکم دیا کہ ہانگ تو ا کو قتل کر دیا جائے۔“

یہاں پہ اس نے وقفہ دیا۔ وہ اب آنکھوں کی پتلیاں سکوڑے اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ گویا سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”وزیر دانا آدمی تھا۔ اس نے ہانگ تو ا کو قتل کرنے کے بجائے چھپا دیا۔“ فاتح نے نظریں تالیہ پہ جمائے بات جاری رکھی۔ ”مگر

باقی چاروں کے اندر غصہ اور بغاوت جنم لینے لگی یہاں تک کہ ایک دوسرے سورمانے ایک دن محل میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ وہ ہانگ تو ا کی موت کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ سلطان نے اسے گرفتار کرنے کا حکم دیا مگر کوئی سپاہی اس کے قریب جانے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ ایسے میں وزیر نے بادشاہ سے ہانگ تو ا کے لئے امان طلب کی اور بتایا کہ اس نے ہانگ تو ا کو مارا نہیں تھا اور صرف وہی اپنے ساتھی سورما

کو پچھاڑ سکتا ہے۔ چنانچہ وزیر ہانگ تو اگلے آیا اور بادشاہ نے اسے معاف کر دیا۔ پھر دونوں سوراؤں میں مقابلہ ہوا اور ہانگ تو انے باغی سورا کو جو ہانگ تو اکی موت کا ہی بدلہ لینے آیا تھا مار دیا اور ایک دفعہ پھر سے سلطان کا پسندیدہ بن گیا۔“

اسٹڈی میں سناٹا چھا گیا۔ فاتح کے عقب میں کھڑکی کے شیشے پہ اتنی دھند جمع تھی کہ سارا منظر دھندلا گیا تھا۔

”تمہارا اس کہانی کے بارے میں کیا خیال ہے، تاشہ؟“

”یہی کہ یہ ایک بے کار کہانی ہے جس میں ہانگ تو انے اس سلطان سے وفا کی جو اسے ناحق قتل کی سزا سنا چکا تھا اور اس دوست کی جان لے لی جو اس کے لئے ہی لڑ رہا تھا۔ میں نے یہ کہانی سن رکھی ہے اور میں کبھی نہیں سمجھ سکی کہ ہانگ تو اگلے دوست نے ہانگ تو اکو زندہ دیکھ کے ہتھیار کیوں نہیں ڈال دیے۔ یا شاید وہ اپنی انا کے پیچھے لڑتا رہا؟ آپ کا اس کہانی کے بارے میں کیا خیال ہے تو اکو؟“

”یہی کہ اسی کو سیاست کہتے ہیں۔ طاقت کی جنگ۔ جیسے ہی ہانگ تو انے طاقتور سلطان کی طرف جاتا دروازہ کھلتا دیکھا اس نے اپنے دوست کو مارنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ کچھ لوگ انسانوں سے وفادار ہوتے ہیں کچھ طاقت سے۔ اور میں یہی تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں تاشہ!“ وہ آگے کو ہوا اور دونوں ہاتھ باہم پھنسا دئے بات جاری رکھی۔

”تم نے وان فاتح کے گھر سے ایک شے چرائی ہے۔ (وہ چونکی۔) اور میں چاہتا ہوں کہ تم وہ مجھے واپس لا دو تاکہ میں تمہارے خلاف پولیس میں شکایت نہ کروں۔“

تالیہ بالکل سن ہو گئی۔ پیر سے نیچے رکھے پرس کو چھوا جس میں وہ بریسلٹ ابھی بھی موجود تھا۔ (یا اللہ... ان کو کیسے علم ہوا؟)

”میں نے... آپ کے ہاں سے... چوری کی ہے؟“ بے یقینی سے دہرایا۔

”اور تم نے وہ فائل اشعر کو دی ہے میں جانتا ہوں۔“

تالیہ کے ابرو اکٹھے ہوئے۔ وہ ٹھٹکی۔ ”کون سی فائل؟“

”میں جانتا ہوں تم یہ ایش کے لئے کر رہی ہو۔ اس کے ساتھ پر قیش زندگی گزارنا تمہارا خواب ہو گا۔ میرا خیال ہے تم اتنی امیر نہیں ہو جتنا خود کو ظاہر کرتی ہو کیونکہ ایک زمانے میں تم ایک سٹرا کردار کی طرح تھیٹر میں کام کرتی تھیں۔ تاشہ آگاپووا۔ یاد ہے؟ اس کے علاوہ بھی تمہارے بارے میں کچھ بہت dishonest سا ہے جو مجھے کھلتا ہے، لیکن مجھے اس سب سے کوئی غرض نہیں کیونکہ آج کے بعد تم ہمارے گھر نہیں آؤ گی۔“

تالیہ کی رنگت سرخ پڑ چکی تھی۔ لب کپکپانے لگے تھے۔ وہ اٹھی اور ہتھیلیاں میز پہ رکھے جھکی۔

”آپ نے مجھے ایک ہی سانس میں جھوٹی چور فراڈ اور gold digger کہہ دیا ہے فاتح صاحب!“ اس کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کے وہ غرائی۔

”جیسا کہ میں نے کہا“ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تم اپنی زندگی میں کیا کرتی ہو۔ مجھے صرف اپنی فائل واپس چاہیے۔“ وہ ہلکے سے کندھے اچکا کے رسان سے بولا تھا۔ بالکل ٹھنڈا۔ کوئی غصہ، طیش کچھ بھی نہیں۔

”میں نے آپ کی کوئی فائل نہیں چرائی۔“ اس کی آنکھیں گلابی پڑ رہی تھیں اور گلارندھر ہاتھا۔

”دیکھو تالیہ... تا شہ... واٹ ایور... کل تک اگر مجھے میری فائل نہیں ملتی تو مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تمہیں پڑے گا۔ تمہاری اپنی کریڈیٹیلیٹی خراب ہوگی۔ ویسے بھی اشعر کو جیسے ہی طاقت میری طرف نظر آئے گی وہ اپنی پرانی صفوں میں واپس آنے کے لئے تمہارے ساتھ وہی کرے گا جو ہانگوانے اپنے دوست کے ساتھ کیا تھا۔“

دھند بڑھتی جا رہی تھی۔ اتنی کہ کمرے میں بھی بھرنے لگی تھی۔ تالیہ اسی طرح ہتھیلیاں میز پر رکھے زخمی نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

”تم ایک آزاد انسان ہو۔ میری فائل تو مجھے مل جائے گی لیکن تمہیں اپنی نظروں میں معتبر ہونے کے لیے کوئی اخلاقی قدم لینا ہوگا۔ اب تم جاسکتی ہو۔“

وہ میز سے ہاتھ ہٹا کے سیدھی ہوئی.... چند لمحوں کی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر دو قدم پیچھے ہٹی۔

”آپ کو واقعی انسانوں کی پہچان نہیں ہے تو انکو!“

وہ اب سیل فون اٹھاتے ہوئے کھڑا ہو رہا تھا۔ سنجیدہ اور بے نیاز۔ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔

تالیہ پیچھے ہٹتی گئی یہاں تک کہ اس کی کمر سے دروازہ لگا تو وہ مڑی اور باہر نکل آئی۔

دھند سی جیسے چھٹی۔ سانس بحال ہوئی۔ اس نے چند گہرے سانس لیے۔

وان فاتح کا اونچا محل خاموش پڑا تھا۔ ملازم کونوں میں دبک گئے تھے۔ سارا کھیل اسے سمجھ آ گیا تھا۔

”عصرہ محمود... تم نے مجھے con کیا۔ تم نے عالم کو con کیا۔ تم نہیں جانتیں کہ عالم کون ہے!“

وہ تیزی سے زینے پھلانگ رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

گدلی دھند نے قلعے کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ دھند میں اشعر کی کار تیار کھڑی تھی اور اشعر ناشتے کے بعد ریلی سے بات کر کے برے موڈ کے ساتھ ابھی باہر نکلا تھا۔ مگر پھر وہ ٹھنک کے رکا۔ ایک کار تیزی سے اندر آئی۔ اس کی فوگ لائٹس آن تھیں۔ وہ سیدھی برآمدے کے سامنے آرکی۔ چند لمحوں بعد عصرہ اس سے نکل کے برآمدے کے زینے چڑھتی اور پر آئی۔ سرخی کوٹ اور اسکرٹ

میں ملبوس بالوں کا جوڑا بنائے، وہ برے موڈ میں لگ رہی تھی۔

”کا کا... اتنی صبح؟“ وہ مسکرایا مگر عصرہ نہیں مسکرائی۔

”میں پریشان ہوں، ایش۔ فاتح بہت غصے میں ہے۔“

”ان کو شک تو نہیں ہوا؟“ اس نے نرمی سے عصرہ کو دونوں شانوں سے تھاما۔

”شک؟ اسے یقین ہے یہ تمہارا کام ہے۔“

”مجھے اپنی فکر نہیں ہے، آپ کا پوچھ رہا ہوں۔ آپ پہ تو شک نہیں ہوا۔“ وہ پراعتما د تھا۔ عصرہ نے گہری سانس لے کر خود کو ڈھیلا

چھوڑ دیا۔

”مجھے خود سے شک ہٹانے کے لئے تالیہ کا نام لینا پڑا۔ وہ ابھی گھر پہ آئی ہے اور فاتح جس طرح اس کی بے عزتی کرے گا، اس

کے بعد تمہاری یہ پسندیدہ لڑکی ہمارے خاندان کے قریب بھی نہیں پھٹکے گی۔“

”یہ لڑکیاں ٹھیک ہو جاتی ہیں، اس کی پرواہ نہ کریں۔“ اس نے ناک سے مکھی اڑائی۔ ”آپ نے بس اپنی شادی کو متاثر نہیں

ہونے دینا۔ اچھا کیا جو تالیہ کا نام لے لیا۔“

”اسی کے لئے تو سب کچھ کیا مگر اب میں panic کر رہی ہوں۔“ وہ پریشان تھی۔ بار بار پیشانی چھوتی۔ کبھی گردن کی پشت پہ

ہاتھ رکھتی۔ ”مجھے ڈر ہے فاتح کو معلوم نہ ہو جائے۔“

”کون بتا سکتا ہے؟ رات کو تو دو گارڈز ہی ہوتے ہیں صرف۔“

”ان کا بندوبست کر لیا ہے۔ وہ زبان نہیں کھولیں گے۔ مگر وہ نیا لڑکا ایڈم۔ وہ باڈی مین۔ وہ گڑبڑ کر سکتا ہے۔“

وہ دونوں اونچے ستونوں والے برآمدے میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ صبح کی گدلی دھند ارد گرد پھیلی تھی اور ملازم باادب

فاصلے پہ جا کھڑے ہوئے تھے۔

”میں رملی سے کہتا ہوں کہ عبد اللہ سے کہے، ایڈم اس کی جگہ لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ دیکھنا، عبد اللہ دو روز قبل ہی بھاگا بھاگا

واپس آئے گا۔ اب بتائیں، کوئی اور مسئلہ؟“

عصرہ اداسی سے مسکرائی۔ ”ایش... کیا میں اپنے شوہر کو دھوکا دے رہی ہوں؟“

”اگر یہ دھوکہ پہلے دیا ہوتا تو آج آریا نہ ہمارے پاس ہوتی۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا تو عصرہ کی آنکھوں میں

پانی بھرنے لگا۔

”وہ کسی اچھے خاندان میں تربیت پا رہی ہوگی، ایش، مجھے یقین ہے۔ وہ ایک دن ہم سے ضرور آ ملے گی۔“

”ان شاء اللہ“ کا کا۔“ اس نے کہتے ہوئے شفقت سے عصرہ کو گلے سے لگالیا۔ عصرہ نے اس کے کندھے پر سر رکھے آنکھیں بند کیں تو دو آنسو ٹوٹ کے چہرے پر پڑ گئے۔

”بیمار آدمی کے منہ کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے“ کا کا۔ اس کو کھانا اور دوا زبردستی کھلانی پڑتی ہے۔ آنگ بنگ جنون کے ہاتھوں بیمار ہیں آپ کی دوا ان کو ناگوار گزر رہی مگر یہی ان کا علاج ہے۔“ وہ نرمی سے اس کا سر تھپکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

چند لمحے وہ خاموشی سے دھند میں کھڑے رہے پھر عصرہ اس سے علیحدہ ہوئی اور آنکھ کا کونا صاف کرتی مسکرائی۔

”اب میں مطمئن ہوں۔ تم عبد اللہ کو بلواؤ۔ صبح تو ایڈم کو میں نے کام سے مارکیٹ بھیج دیا تھا اب آتا ہے تو اس کا بندوبست کرتی ہوں۔“

پھر اس نے گردن گھما کے دیکھا۔

”دھند چھٹ رہی ہے۔ شکر۔“ سبزہ زار تھوڑا تھوڑا دکھائی دینے لگا تھا۔ دھند ہلکی ہو رہی تھی۔ سورج روشن چمکنے لگا تھا۔ اسے واپس گھر جانا تھا۔ تھینا تالیہ اب تک جاچکی ہوگی۔ جان چھوٹی۔

☆☆=====☆☆

وان فاتح کی رہائش گاہ پہ سورج اب مکمل طور پہ طلوع ہو چکا تھا۔ دھند قریباً چھٹ چکی تھی۔ ایڈم ہاتھ میں شاپنگ بیگ لئے لاؤنج میں داخل ہوا تو عصرہ سامنے بڑے صوفے پہ براجمان تھی۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے مسکراتی ہوئی وہ جیسے اسی کی منتظر تھی۔

”میم“ کیا مجھے دیر ہوگئی؟ سر آفس چلے گئے؟“ وہ باہر فاتح کی کار غائب دیکھ کے پریشان ہو گیا تھا۔

”عثمان ہے ان کے ساتھ بے فکر ہو۔ سامان آسانی سے مل گیا تھا؟“ وہ نرمی سے گردن اٹھائے اسے دیکھتی پوچھنے لگی۔

”جی میم.... سب کچھ مل گیا۔ میں پھر اب آفس جاؤں؟“

”ایڈم.... ریلیکس۔ تم آج چھٹی لو اور گھر جاؤ۔“

ایڈم جو بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا، چونکا۔ ”مگر آج باس کی پارلیمنٹ میں تقریر ہے ان کو کافی کے دو مگ چاہیے ہوتے ہیں اور“

”عبد اللہ واپس آ گیا ہے۔“ اس نے نرمی سے ہم پھوڑا تو ایڈم کی متفکرانہ انداز میں چلتی زبان کو بریک لگ گئی۔ لب ”اوہ“ میں سکڑے۔ پھر نگاہیں جھکالیں۔

”یعنی میری جاب ختم“ میم؟“ آسمان سے آہستہ آہستہ زمین پہ آگرا۔ اتنے دھیرے سے کہ چوٹ لگنے کی آواز بھی نہیں آئی۔

”ہاں مگر ایش تمہارے اور تمہاری ماں کے لئے نوکری کا بندوبست کر رہا ہے۔ عبد اللہ تمہارے ہی محلے کا ہے نا؟ کوئی نوکری ملی تو

عبداللہ تمہیں بتا دے گا۔ یہ پیسے رکھ لو۔ یہ تنخواہ کے علاوہ ہیں۔ تم نے اپنی منگیتر کے لئے تحفہ لینا تھا نا۔“ عصرہ نے ایک پھولا ہوا لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

”میں تنخواہ تو بینک میں آئے گی وہی کافی ہے میں یہ نہیں رکھ سکتا اور تحفے کے لئے وہ سکہ بہت تھا۔“ وہ اداسی سے بولا۔
 ”رکھ لو۔ جیولرزمیننگ کے الگ پیسے لیتے ہیں۔ لے لو ایڈم۔“ ایڈم نے نظریں جھکائے ہاتھ بڑھایا اور لفافہ تھام لیا۔
 ”اب پریشان نہ ہو۔ جاؤ اور اپنی منگیتر کے لئے تحفہ لو۔ کبھی کوئی کام ہو تو آ جانا۔ یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔“ مسکرا مسکرا کے اب عصرہ محمود کے جڑے دکھنے لگے تھے۔ اس سے زیادہ اداکاری وہ نہیں کر سکتی تھی۔ اب جلد وہ اکتانے والی تھی۔ ایڈم نے اس کا صبر نہیں آزمایا۔

”میں باس سے آخری دفعہ مل آؤں آفس جا کر؟“ وہ جیسے اس نودن کی کہانی کا closure چاہتا تھا۔

”آج اس کا موڈ نہیں اچھا۔ اس کو تقریر بھی کرنی ہے۔ وہ یوں ڈسٹرب ہوگا ایڈم۔“

”نہیں نہیں“ میں ان کو ڈسٹرب نہیں کروں گا۔ کوئی بات نہیں۔“ وہ فوراً سنبھل گیا۔ اپنا مقام یاد آ گیا۔ پھر اسے خدا حافظ کہہ کے لفافہ تھامے باہر نکل آیا۔ عصرہ نے گہری سانس لی اور ریموٹ اٹھا کے ٹی وی لگا لیا۔ سارے مسئلے ختم ہوئے۔
 ایڈم باہر آ کے خالی خالی سا اطراف میں دیکھنے لگا۔ کہاں وہ بھاگ بھاگ کے سامان لے کر فاتح کے گھر پہنچا اور کہاں سارے دن کی مصروفیت چٹکی میں ختم ہو گئی تھی۔ فراغت ہی فراغت... نودن کی تیز مصروف زندگی... وہ ان طاقتور لوگوں کے درمیان بیٹھنا.... سب را کھ ہو گیا تھا۔

اور اس نے کتنے ہی مواقع گنوا دیے۔ نہ تالیہ مراد کے بارے میں فاتح سے پوچھ سکا کہ وہ واقعی پولیس آفیسر ہے یا نہیں۔ نہ ہی عثمان کے بارے میں فاتح کو آگاہ کر سکا کہ وہ جھوٹ بول کے اشعر سے ملنے جاتا رہتا ہے۔ ایڈم کی تو زندگی سوائے ناکامی کے کچھ نہیں ہے۔ (اس نے سوچا۔) اب وہ تاشہ یا تالیہ جو بھی تھی اس کو کیا جواب دے گا؟ اب وہ فاتح کی حفاظت کیسے کرے گا؟
 سوال بہت سے تھے اور جواب ندارد۔ وہ سر جھٹکتا باہر کی طرف بڑھ گیا۔ ان لوگوں کو اس کی ضرورت کہاں تھی بھلا؟ وہ اس کے بغیر بھی ٹھیک تھے۔ اسے فاطمہ کا تحفہ لینا تھا۔ سارے کام ایک طرف وہ اس سکے کو ترزا کے فاطمہ کے لئے انگوٹھی بنوانے لگا آج

اس نے تہیہ کر لیا تھا۔ اسے اب اپنی چھوٹی بے رونق معمولی زندگی میں واپس جانا ہی تھا۔

☆☆=====☆☆

گدلی دھند کا غبار دھیرے دھیرے چھٹتا جا رہا تھا۔ اس پارک میں بڑی سی جھیل بنی تھی۔ کنارے پہ جا گنگ ٹریک تھا جو دور

درختوں میں گم ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ کچھ لوگ واک کر رہے تھے کچھ بیٹھے سستارہے تھے۔ ایسے میں بھاری بھر کم داتن، متلاشی نظروں سے دائیں بائیں دیکھتی چلتی آرہی تھی۔ دفعتاً ایک بیچ کے سامنے وہ رکی۔

اس پہ تالیہ بیٹھی تھی۔ سفید مٹی کوٹ پہنے۔ سر ہاتھوں میں گرائے۔

”یعنی تمہیں شکار بازوں کی داستان پہ یقین آئی گیا اور اب تم پوری کہانی دوبارہ میرے منہ سے سننا....“

”عصرہ نے میرے ساتھ کھیل کھیلا ہے۔“ اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا تو اس کا چہرہ دیکھ کے داتن چونکی۔ اس کی آنکھیں اور ناک سرخ پڑ رہے تھے۔ وہ سخت ہرٹ لگ رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ داتن پریشانی سے ساتھ بیٹھی اور اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

”عصرہ نے مجھے جلدی بلوایا تاکہ میں پینٹنگ مکمل کر لوں اور پھر وہ غائب ہو گئی تاکہ وہ ان فاتح مجھے ڈانٹیں.... اور انہوں نے

داتن.... انہوں نے مجھے چور کہا.... بددیانت، جھوٹی اور فراڈ کہا۔“

”یہ سب تو ہم ہیں تالیہ۔“

تالیہ نے سلگتی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”مگر انہوں نے مجھ پہ کسی فائل کی چوری کا الزام لگایا جو میں نے نہیں چرائی۔ یہ زیادتی ہے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سامنے وسیع جھیل تھی اور ساتھ ٹریک۔ وہ سینے پہ بازو لپیٹے، خفا خفا سی جھیل کنارے چلنے لگی۔ داتن نے اس کا پرس اٹھایا اور پیچھے لپکی۔

”یعنی اب وہ تمہیں اپنے گھر نہیں آنے دیں گے؟ چلو اچھا ہوا، اس سکے سے جان چھوٹی۔“

”اس سکے کے لیے ان کے گھر جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ وہ ایڈم کے پاس ہے اور اسے میں سنبھال لوں گی، مگر داتن.... انہوں نے مجھ پہ غلط الزام لگایا۔“ وہ تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی اور داتن اس کی رفتار سے ملنے کی کوشش میں ہاپنے لگی تھی۔ تالیہ کے اس طرف جھیل تھی جو دھوپ میں چمک رہی تھی۔ داتن تالیہ اس کو دیکھنا چاہتی تو تیز آتی روشنی آنکھوں کو چندھیا دیتی۔ وہ سامنے دیکھتے ہوئے پھولے سانسوں کے درمیان کہنے لگی۔

”تم نے کون سا دوبارہ ان سے ملنا ہے جو ان کی باتیں اہمیت رکھیں؟“

”عصرہ نے مجھے پھنسیا ہے۔ وہ جانتی ہے کس نے فائل چرائی ہے، یقیناً اس کے بھائی نے۔ اگر وہ بے خبر ہوتی تو اپنے شوہر کی فائل چرانے والی لڑکی سے پینٹنگ مکمل نہ کرواتی۔ اس نے اصل چور کو بچانے کے لیے یہ سب کیا ہے۔ مجھے وہ فائل فاتح کو واپس لا کے دینی ہے۔“ وہ جھیل کے سرے پہ چل رہی تھی۔ سنہری چوٹی کندھے پہ آگے ڈال رکھی تھی، جس سے ناراض لٹیں نکل کے گردن کو چھو رہی تھیں۔

”پہلے گھائل غزال اور اب یہ فائل... فاتح کے مسائل تمہارے مسائل نہیں ہیں، تالیہ۔“ داتن کا سر پیٹ لینے کا دل چاہا۔
 ”گھائل غزال کو بھی میں دیکھ لوں گی مگر وہ جو بھی فائل ہے وہ اس کے لئے ضروری ہے۔“ وہ رکی اور داتن کی طرف گھومی۔ اب
 دھوپ میں چمکتی جھیل اس کے پیچھے تھی جس کے باعث وہ اندھیرے میں نظر آرہی تھی۔ داتن نے ماتھے پہ ہاتھ کا چھجا بنا کے اسے
 دیکھا۔

”تمہیں ابھی سکے بھی ڈھونڈنا ہے اور سمیج کو بھی سنبھالنا ہے ایسے میں تم سب چھوڑ کے وہ فائل اشعر سے چرانا چاہتی ہو؟“
 ”کس نے کہا کہ میں اسے چراؤں گی؟“ وہ پہلی دفعہ مسکرائی۔ وہ ایسے صرف تب مسکراتی تھی جب اس کے پاس پلان ہوتا تھا اور
 تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا تھا۔
 ”پھر کون؟“

”حالم!“ اندھیرے میں کھڑی تالیہ مسکرائی۔ کرنیں اس کے اطراف سے نکل کے سامنے پڑ رہی تھیں۔ ”حالم واپس لائے گا وہ
 فائل!“

داتن پدوکا کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ چھجا بنایا ہاتھ نیچے گر گیا۔
 ”تم حالم کو اس معاملے میں لانا چاہتی ہو؟“
 ”ہم نے پچھلے سال ایک ممبر پارلیمنٹ فارض ڈینیل کی بیوی کا لاکٹ چرایا تھا اور حالم نے بھاری رقم لے کر لاکٹ واپس لا دیا
 تھا۔ آگے تمہیں معلوم ہے کہ فارض صاحب کو کیسے استعمال کرنا ہے۔“
 داتن نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

”وان فاتح نے تمہاری توہین کی۔ تم پھر بھی اس کے ساتھ اچھائی کیوں کرنا چاہتی ہو، تالیہ؟“
 تالیہ کے اطراف سے اتنی تیز دھوپ نکل رہی تھی کہ اس کا چہرہ تاریک لگ رہا تھا۔ داتن اس کے تاثرات نہیں دیکھ پارہی تھی مگر
 اس کی آواز.... اس میں عجیب جادوئی پن تھا۔

”کیونکہ ایک دن آئے گا جب وہ مجھے کہیں گے کہ میں ان کے ساتھ رہوں۔ ان کو میری ضرورت ہے۔ میں اس دن کے انتظار
 میں وہ وعدہ نبھارہی ہوں جو ابھی انہوں نے مجھ سے لینا ہے۔“ وہ کہہ رہی تھی اور عقب میں سورج کی کرنیں جھیل کے پانی پہ رقص کر
 رہی تھیں.... گویا سونے کا چمکتا ہوا ڈھیر ہو جو حد نگاہ تک پھیلا ہو.....

دو دن سے چھائی گدلی دھند اب چھٹ رہی تھی اور دن طلوع ہو رہا تھا.....

☆☆=====☆☆

ملائیشین پارلیمنٹ کی عمارت میں ایک اونچا ٹاور تھا جو ایک زمانے میں شہر کا بلند ترین ٹاور ہوا کرتا تھا۔ یہ ملے کرنسی کے سکے پہ بھی نقش کیا ہے، مگر کم لوگ جانتے ہیں کہ اونچے ٹاور میں صرف ورکرز کے آفس وغیرہ ہیں۔ اور اس کے ساتھ جو بظاہر چھوٹی، ٹینٹ نما عمارت بنی ہے، پارلیمنٹ اور سینیٹ کے ایوان دراصل اس میں موجود ہیں۔

اس وقت وان فاتح پارکنگ میں رکی کار سے باہر نکل رہا تھا۔ گرے سوٹ میں ملبوس بالوں کو دائیں طرف جمائے، وہ ازلی مسکراہٹ چہرے پہ سجائے ہوئے تھا۔

”میری کافی کا دوسرا گم کہاں ہے؟“ عثمان سے چھوٹے ہی پوچھا تو عثمان گڑبڑا گیا۔

”سوری سر، یہ عبداللہ کی ڈیوٹی ہے اور وہ پہنچا نہیں ہے ابھی تک۔“

”تو ایڈم کہاں ہے؟“ فاتح نے صرف ایرواٹھایا۔ نہ غصہ، نہ اکتاہٹ۔

”سر وہ بھی شاید چھٹی پہ....“

”ویری پور مینجمنٹ۔“ بغیر غصے کے تبصرہ سا کیا اور آگے بڑھ گیا۔ سامنے ہی سوٹ اور روایتی لباس، ٹوپوں میں موجود افراد

عمارت میں داخل ہوتے نظر آرہے تھے۔ فاتح کو دیکھتے ہی بہت سے اس کی طرف بڑھے۔ وہ بھی مسکراتا ہوا ان کے قریب آیا۔ سر کے خم سے سلام کا جواب دیا۔ اکثریت ممبرز پارلیمنٹ کی تھی۔

”وان فاتح.... آپ کے گھر سنا ہے چوری ہو گئی؟“

”کوئی کاغذات وغیرہ تھے؟ پولیس میں رپورٹ کی؟“

”اللہ کرے زیادہ نقصان نہ ہوا ہو۔“

فاتح کی مسکراہٹ برقرار رہی۔ سر کے خم کے ساتھ ”شکریہ... زیادہ مسئلہ نہیں ہے“ کہہ کے آگے بڑھتا گیا۔ جیسے ہی عمارت کے

اندر لفٹ تک پہنچا، اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی اور قدرے برہمی سے وہ عثمان کی طرف پلٹا۔ ”یہ بات ساری دنیا کو کیسے معلوم ہوئی؟“

”پتہ کرتا ہوں سر۔“ وہ فوراً واپس دوڑا اور فاتح نے سر جھٹکتے ہوئے لفٹ کا بٹن دبا دیا۔

ملے پارلیمنٹ کے ساتھ بنے اونچے ٹاور میں اپوزیشن پارٹیز کو جو فلور ملے تھے وہ تیرہویں اور چودہویں تھے جس بات کا اکثر

مذاق بنایا جاتا تھا کیونکہ یہ بدقسمت نمبرز سمجھے جاتے تھے۔ ایسے ہی ایک بدقسمت فلور پہ وہ اپنے آفس میں داخل ہوا ہی تھا کہ عثمان واپس آیا۔

”ابھی آدھا گھنٹہ قبل...“ وہ ہانپ رہا تھا۔ ”...سب ممبرز پارلیمنٹ کو ان کے ورک ای میل پہ میلز ملی ہیں جس پہ ایک جعلی خبر بنا کے

لکھا گیا ہے کہ آپ کے گھر چوری ہوئی ہے۔“

”اشعر۔“ اس نے دل میں سوچا اور عثمان کو جانے کا اشارہ کر دیا اور اپنی ڈائری کھول لی۔

اب وہ آفس میں اکیلا تھا۔ نفیس سا آفس جولیڈر آف دی اپوزیشن کو ملا کرتا تھا۔ پچھلے سال اپوزیشن کے لیڈر نے (جو کہ فی الوقت باریس نیشنل کا چیئر مین بھی تھا) اس منصب سے استعفیٰ دے دیا تھا جس کے بعد اپوزیشن نے وان فاتح کو اپوزیشن لیڈر چنا تھا۔ پچھلے ایک سال سے یہ اس کا آفس تھا۔

دروازے پہ آہٹ ہوئی تو اس نے نوٹس سے نظر اٹھائی۔ عبداللطیف صاحب چوکھٹ میں کھڑے تھے۔ سفید بالوں اور جناح کیپ والے عبداللطیف روایتی لباس میں ملبوس تھے۔ فاتح نے عینک اتاری، نوٹس رکھے اور مسکرا کے ان کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

”یہ چوری کا کیا قصہ ہے؟“ وہ کرسی سنبھالتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”ملا کہ والے گھر کے ڈاکو نمٹس غائب ہو گئے ہیں۔ قوی امکان ہے کہ اشعر نے یہ کیا ہے۔ مگر خیر...“ اس نے شانے اچکائے۔

”مل جائیں گے۔“

”مگر اشعر نے یہ کیا کیسے؟“ وہ حیران ہوئے تھے۔ کھڑکی کے بلائینڈز بند ہونے کے باعث آفس میں نیم اندھیرا سا تھا مگر فاتح کا چہرہ پھر بھی روشن دکھائی دیتا تھا۔

”1849ء میں ایک آدمی ہوتا تھا امریکہ میں ولیم تھامسن نام کا۔“ وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔ ”بظاہر بڑا قیمتی لباس پہنے متاثر کن سا لگتا تھا۔ ایک دن وہ سڑک پہ آیا اور ایک ایک شخص کو روک کے پوچھنے لگا، کیا آپ کو مجھ پہ اتنا کانفیڈنس ہے کہ آپ کل تک کے لئے اپنی گھڑی میرے پاس رکھوا دیں؟ یہ اتنا ڈائریکٹ سوال تھا جس کا تعلق ایک انسان کی عزت نفس سے تھا کہ بہت سے لوگوں نے لحاظ میں اس کو اپنی گھڑی دے بھی دی۔ وہاں سے اس کھیل کا نام کانفیڈنس گیم یا con گیم پڑا اور ایسے آدمی کو کانفیڈنس مین یا con مین کہا جانے لگا۔ کون آرٹسٹ (بہروپیہ) وہ آدمی ہوتا ہے جو اس چیز کو استعمال کرتا ہے جس پہ ان کے شکار کا مکمل بھروسہ ہوتا ہے... اور... (گہری سانس لی)... عصرہ ہر دوسرے آرٹ کلکٹر یا آرٹسٹ سے بہت جلدی متاثر ہو جاتی ہے اس لئے اشعر نے ہماری زندگیوں میں ایک اسی شعبے سے تعلق رکھنے والے شخص کو داخل کیا جس نے یہ چوری کی۔“

”مرد ہے یا عورت؟“ انہوں نے حیرت بھری دلچسپی سے پوچھا۔

”میں اس کے پیچھے اس کے بارے میں یوں بات نہیں کرنا چاہتا۔ جو بھی ہے اپنے کیے کی سزا اس کو مل جائے گی۔“ وہ بے نیاز

لگتا تھا۔

”اور اگر کاغذات نہ ملے؟“ ان کو تشویش ہوئی۔

”اللہ مالک ہے۔ میں کوئی اور صل نکال لوں گا۔ اور پھر میں کہاں ان چیزوں سے ہار مانتا ہوں، عبداللطیف۔“ وہ ابھی کچھ اور بھی کہنے جا رہا تھا کہ دروازہ ذرا سی دستک سے کھلا۔ دونوں نے چونک کے اس طرف دیکھا، پھر دونوں کے چہروں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”فارض صاحب... آئیے۔“ فاتح نے گرمجوشی سے مسکرا کے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ جو صاحب اندر آئے وہ سوٹ میں ملبوس تھے۔ پستہ قد اور چینی نقوش کے حامل عینک لگائے خوش مزاج سے لگتے تھے۔ سلام کیا اور کرسی سنبھالی۔

”میں نے آپ کے گھر میں چوری کا سنا، فاتح!“ وہ تشویش سے بیٹھتے ساتھ ہی بولے۔ ”پولیس کارروائی کر رہی ہے کیا؟“

”زیادہ فکر کی بات نہیں۔“ اس نے نرمی سے مسکرا کے ان کو تسلی دی۔

”آپ مطمئن لگ رہے ہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ اندر سے پریشان ہیں، لیکن آپ ٹھہرے لیڈر... کبھی کمزوری ظاہر نہیں کریں گے۔ بہر حال... آپ نے کسی انویسٹی گیٹر کو ہار کرنے کا سوچا ہے؟ یقیناً آپ اپنے گھر پولیس والوں کا داخلہ پسند نہیں کریں گے۔“

”میں ہینڈل کر لوں گا۔“ وہ نرمی سے بات کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا فارض صاحب کی بہت عزت کرتا ہے۔

”پچھلے سال میری بیوی کا ایک قیمتی لاکٹ چوری ہوا تھا۔ اس کی نانی کی نشانی۔ وہ بھی بھری پارٹی میں سے۔ مجھے کسی نے اس اسکام اور فراڈ انویسٹی گیٹر کا بتایا تو میں نے اس سے رابطہ کیا۔ اس نے چند گھنٹوں میں برآمدگی کر دی۔ چوری کے پہلے چند گھنٹے بہت اہم ہوتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو اس کا نمبر دیتا ہوں۔“

”میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی پرائیوٹ انویسٹی گیٹر ز یہ مجھے اتنا اعتماد نہیں ہے۔“

”مجھ پہ تو ہے نا؟ میں نے اس آدمی سے کام لیا ہوا ہے۔ انتہائی ذہین اور شاطر ہے۔ تھوڑا گھمنڈی اور مغرور بھی ہے، پیسے بھی کافی لے گا لیکن اس کی مہارت کے اتنے پیسے تو بنتے ہیں فاتح صاحب۔“ وہ مصر ہوئے۔

”اگر ضرورت پڑی تو میں آپ کو بتاؤں گا۔“ اس نے رسان سے بات کو ٹال دیا۔

فارض ڈیمیل باہر آئے اور فون پہ ایک نمبر ملا کے کان سے لگایا۔

”حالم... میں نے تمہاری طرف ریفر کیا ہے وہ ان فاتح کو۔ مگر مجھے نہیں معلوم وہ رابطہ کرتے ہیں تم سے یا نہیں۔ اب تک چوری کی خبر اتنی پھیل چکی ہے کہ بہت سے انویسٹی گیٹر ز ان سے رابطہ کر کے ان کو اپنا کلائنٹ بنانے کی کوشش کریں گے۔ تمہارا احسان تھا مجھ پہ میں اتنا ہی کر سکتا تھا۔“ پیشانی کو مسلتے ہوئے مایوسی سے کہہ رہے تھے۔

”خیر... مجھے کون سا کلائنٹس کی کمی ہے...“ جواب میں حالم کا اکھڑا ہوا لہجہ سنائی دیا تھا۔ ”میں تو آپ کے لئے کہہ رہا تھا... جب وہ ان فاتح کا مسروقہ مال برآمد کر کے دوں گا تو وہ آپ کے ہی مقروض ہوں گے۔ ورنہ مجھے کیا۔ ہونہہ۔“ کھٹاک سے فون بند ہو گیا۔

فارض صاحب نے گہری سانس لے کر فون کان سے ہٹایا۔ مغرور اور گھمنڈی حامل.... وہ کبھی نہیں بدل سکتا تھا۔

☆☆=====☆☆

وہ کوالا پور کا ایک مصروف بازار تھا۔ درمیان میں پتھرلی روش تھی جس پہ خریدار چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے میں ایک دکان کے آگے چھتری تلے کرسیاں میزیں لگی تھیں جن میں سے ایک پہ تالیہ بیٹھی تھی اور ابھی ابھی اس نے ہونہہ کہہ کے فون بند کیا تھا۔ داتن نے ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔

”اگر حامل اپنے سابقہ کلائنٹ کو تھوڑی خوش اخلاقی دکھا دے تو حامل کا کیا جاتا ہے؟“

”کس خوشی میں؟ حامل کا مارکیٹ میں کوئی امیج ہے، کوئی رعب ہے، اسے ختم تھوڑی کرنا ہے؟“ وہ نزوٹھے پن سے بولی۔ ٹیک لگائے، ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھی تھی۔ سفید کوٹ اتار دیا تھا اور زرد فرائڈ نمائیش دکھائی دے رہی تھی۔ سنہری چوٹی آگے کو ڈال رکھی تھی۔

”خیر... میں نے ای میل کر کے دس منٹ میں ساری پارلیمنٹ میں چوری کی خبر پھیلا دی تھی۔ فارض سمجھا ہوگا کہ حامل کو بھی اسی طرح اڑتے اڑتے خبر ملی ہے اور وہ کلائنٹ بنانا چاہ رہا ہے۔ کیا کہہ رہا تھا وہ؟ فاتح پھنس گیا؟“

”دیکھتے ہیں۔“ وہ پرامید تھی۔ پھر گھڑی دیکھی۔

”ایڈم آنے والا ہوگا۔ تم اب جاؤ اور کام شروع کرو۔ ہمیں معلوم کرنا ہے کہ کس نے فائل چرائی ہے۔“

”ابھی تو فاتح نے ہمیں ہار ہی نہیں کیا۔“

”کہانا، مجھے وہ وعدہ نبھانا ہے جو اس نے مجھ سے کبھی مستقبل میں لینا ہے۔ جاؤ موٹی! کام شروع کرو۔“ داتن ناک سکوڑ کے اٹھ کھڑی ہوئی اور بیگ اٹھالیا۔

”یہ وہ پہلا کیس ہوگا جو حامل ایمانداری سے حل کرے گا، کیونکہ پچھلے ہر کیس میں حامل خود ہی چور ہوتا تھا۔“ چڑانے کو بولی مگر تالیہ نے اثر نہیں لیا۔ بس میز پہ رکھا سفید بیٹ اٹھا کے سنہری بالوں پہ رکھ دیا اور چہرے کے سامنے اخبار پھیلا لیا۔ گویا اب وہ چند منٹ یہاں سستا ناچا ہتی تھی۔

”چے تالیہ!“ زیادہ دیر نہیں گزری جب ایڈم کی آواز پہ اس نے اخبار ہٹا کے دیکھا۔ وہ سادہ پینٹ شرٹ میں ملبوس ہاتھ میں شاپنگ بیگ اٹھائے سامنے والی کرسی کھینچ رہا تھا۔ کپٹی پہ پسینے کے قطرے تھے گویا دھوپ میں چل کے آ رہا ہو۔

”تم نے اس بازار میں ملنے کے لئے کیوں کہا؟“ تالیہ نے ایک نظر شاپنگ بیگ پہ ڈالی جو اس نے میز پہ رکھ دیا تھا۔

”دراصل میں یہاں آیا ہوا تھا، اگر کہیں دور ملتا تو بس کا کرایہ بہت لگ جاتا۔“ وہ سادگی سے کہہ کے بیٹھ گیا۔ چہرے پہ شفاف سی

مسکراہٹ تھی۔ ”میری جاب ختم ہو گئی آج“ چے تالیہ۔“
 ”آج کیوں؟“ وہ چونکی۔ ”ابھی تو دو دن رہتے تھے۔“
 ”کیونکہ عبداللہ واپس آ گیا ہے۔“

”خیر... میرے نزدیک تمہارے گیارہ دن ابھی ختم نہیں ہوئے۔ تمہاری جاب جاری ہے۔“ وہ ٹیک لگائے سر پہ ترچھا ہیٹ رکھے مسکرا کے بولی۔

”اوکے۔“ وہ ہلکا سا مسکرایا۔ ”اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ وہ پر جوش اور تجسس تھا۔ تالبعدار سا تالبعدار۔
 ”ہمیں رپورٹ ملی ہے کہ وان فاتح کے دشمن صرف وان فاتح کے پیچھے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اس گھر میں موجود ایک قدیم artefact کو بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں... تم نے جب فاتح صاحب سے میرا ذکر کیا ہوگا تو انہوں نے بتایا تو ہوگا نا؟“ گہری آنکھیں ایڈم پہ جمی تھیں۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔
 ”میں ان سے مل بھی نہیں سکا اور پوچھنا عجیب سا لگتا تھا۔“ (شکر!)

”خیر... تم ان کے لئے اجنبی ہو ظاہر ہے وہ نہیں بتائیں گے۔“ تالیہ نے سکون کی سانس لی۔ ”یہ اینٹیک پیس فی الوقت ان کے پاس موجود نہیں ہے اور وان فاتح نہیں جانتے کہ وہ کہاں گیا۔ یہ دیکھو... کیا تم اس کو پہچانتے ہو؟“ اس نے ایک کاغذ کھول کے ایڈم کے سامنے رکھا۔

وہ پولیس رپورٹ لگتی تھی۔ نیشنل ٹریڈر۔ (قومی ورثہ) اور ساتھ اس کی تاریخی اہمیت۔ مگر ایڈم کی نظر پر عین تصویر پہ جم گئی۔ سنہرے رنگ کا سکہ۔ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

”یہ؟ یو...“ اس نے بوکھلا کے تالیہ کو دیکھا۔ ”یہ تو مسز عصرہ نے مجھے دے دیا تھا۔“
 ”اوہ!“ تالیہ نے لب سکڑے۔ ”شاید عصرہ فاتح صاحب کو بتانا بھول گئیں۔ خیر ایڈم۔ تمہیں وہ سرکار کو واپس کرنا ہوگا کیونکہ وہ سرکاری خزانہ ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ سرکاری خزانہ ہے۔“ وہ پریشان نظر آنے لگا تھا۔
 ”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ایڈم بلکہ سرکاری خزانہ واپس لوٹانے پہ سرکار تمہیں بونس دے گی اور...“ وہ رسان سے اس کو تسلی دینا چاہ رہی تھی مگر....

”میں نے اس کو تو وا کے اپنی منگیتر کے لئے ابھی ابھی انگوٹھی بنوائی ہے چے تالیہ۔“
 تالیہ کا سارا سکون اور اعتماد غارت ہوا۔ دماغ بھک سے اڑا۔ ”واٹ؟“ وہ کرنٹ کھا کے سیدھی ہوئی۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ

گئیں۔

”تم.... بے وقوف.... بے عقل جلد باز انسان.... یہ تم نے کیا کر دیا ہے۔ کدھر.... کدھر ہے وہ انگوٹھی....“ پھر اس نے خود ہی شاپر میز سے جھپٹا اور کھولا۔ ڈبے کے اندر سے انگوٹھی نکالی۔ انگلیوں میں ٹٹول کے اسے دیکھا۔ ”اس نے تمہارے سامنے سکے کو پگھلایا؟ بتاؤ میں جو پوچھ رہی ہوں۔“

”نہیں۔ وہ سکہ اندر لے گیا اور انگوٹھی کے ساتھ واپس آیا۔ ڈیزائن میں نے اسے بتا دیا تھا۔ فاطمہ کو اسکے والد نے بچپن میں....“ مگر تالیہ کو اسکی لواستوری میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تیزی سے اٹھی۔ ”کہاں ہے وہ شاپ؟“

”یہیں قریب میں ہے... مگر اب کیا ہو گا چے تالیہ۔“ وہ پریشانی سے کھڑا ہوا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ ایک ہاتھ میں پرس اٹھایا، دوسرے میں انگوٹھی دبوچی اور جارحانہ انداز میں آگے بڑھ گئی۔ وہ اس کے پیچھے لپکا۔ بازار میں رش بڑھتا جا رہا تھا۔ دھوپ کی حدت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ دونوں بھیڑ میں آگے پیچھے چلتے جا رہے تھے۔ آگے چلتی تالیہ کی چوٹی کندھے پہ سامنے کو پڑی تھی۔ پیچھے چلتے ایڈم کو اس کی گردن کی پشت پہ گول سانشان صاف نظر آ رہا تھا۔

☆☆=====☆☆

ایوان میں نشستیں انگریزی کے حرف U کی صورت لگی تھیں۔ مرکزی مقام پہ اسپیکر کا اونچا چبوترہ تھا جہاں وہ اپنی بلند کرسی پہ بیٹھا، کاغذات کو عینک لگا کے پڑھ رہا تھا۔ اولین نشستوں پہ وزیراعظم بیٹھی نظر آرہی تھی۔ گردن کڑائے، سر پہ اسٹول لئے، وہ بت کی طرح بیٹھا کرتی تھی۔ اوپر ہال میں U کی ہی صورت میں گیلری بنی تھی جہاں کرسیاں بچھی تھیں۔ رپورٹرز اور حاضرین وہاں بیٹھے ایوان کی کارروائی دیکھ رہے تھے۔

پارلیمنٹ کسی بھی جمہوری ملک کا سب سے بڑا ادارہ ہوتا ہے۔ جمہور کا مطلب ہے ”عوام“۔ جمہوری ملک وہ ہوتا ہے جہاں عوام ووٹ دے کر اپنا صدر یا وزیراعظم چنتے ہیں۔ بادشاہت جن ملکوں میں ہوتی ہے وہاں بادشاہ اپنا وارث خود چنتا ہے جو عموماً اس کا بیٹا ہوتا ہے۔

ملائیشیا، چونکہ جمہوری ملک ہے، اس لئے اس کا پارلیمان ملک کا سب سے بڑا اور مقدس ادارہ ہے۔ یہاں جو لوگ اپنے اپنے علاقوں سے ووٹ لے کر جیت کے آتے ہیں، جمع ہوتے ہیں اور ملک کے قانون بناتے ہیں۔ سیاستدانوں کا صرف ایک کام ہوتا ہے۔ مل بیٹھ کے قانون بنانا۔ ملک کے اداروں کو مضبوط کرنا۔

آج بھی یہاں یہی ہو رہا تھا۔ صوفیہ رٹمن بل لائی تھی، یعنی ایک نیا قانون اس نے تمام ممبرز پارلیمنٹ کے سامنے رکھا تھا اور اس کے لئے ووٹنگ ہو رہی تھی۔ صوفیہ کی جماعت کے قریباً دو سو سے زائد لوگ پارلیمان میں تھے اور وان فاتح کی باریسن نیشنل کے

ساتھ لوگ۔ رپورٹرز جمائیں روکتے پہلے سے لکھ رہے تھے کہ بل پاس ہو جائے گا۔ کہاں دوڑھائی سواور کہاں ساٹھ۔ وہ عبداللطیف کے قریب کرسی پہ ٹیک لگائے انگلیاں بانیں گال تلے رکھے کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اسی اثناء میں دوسری طرف اشعر آکے بیٹھا۔

”میں نے پارلیمان میں آتے ہی سنا کہ آپ کے گھر چوری ہو گئی ہے؟ کا کا نے بھی نہیں بتایا۔“ تشویش سے اس کی طرف جھکے وہ بولا تو فاتح نے صرف ایک گہری نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ ”Who Cares?“ اور سامنے دیکھنے لگا۔ اشعر البتہ ابھی تک تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”امید ہے زیادہ نقصان نہیں ہوا ہوگا۔“

وان فاتح نے جواب نہیں دیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مائیک درست کیا۔ اس کی تقریر کا وقت ہو چکا تھا۔ اشعر زیر لب مسکرا دیا۔ ”جناب اسپیکر مجھے کچھ کہنا ہے۔“ سوٹ میں ملبوس مدہم مسکراہٹ لئے وہ دراز قد اور اسمارٹ سا آدمی کہنے لگا۔ ”حکومتی اراکین کو چاہیے کہ وہ تحمل رکھیں۔ میں ان کو بور نہیں ہونے دوں گا۔“ ہال میں قہقہہ گونجا۔ دلچسپی بڑھی۔ توجہ اس کی جانب مبذول ہوئی۔

”کل مجھے کسی نے کہا کہ آج اس بل کو ڈھائی سو ووٹ مل جائے ہیں تو ہم ساٹھ اپوزیشن اراکین کے ”ناں“ میں ووٹ کرنے کا کیا فائدہ؟“ وہ گردن گھما کے پورے ہال کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”میں ملائیشیاء کے لوگوں کو آج ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ میرے لوگ جب بھی ایک بڑے عدد کے مقابلے میں چھوٹے عدد کی مخالفت دیکھتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ ان چند لوگوں کی ہاں یا ناں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ غلط سوچ ہے۔ کیونکہ مخالفت عددی نہیں اصولی ہوتی ہے۔ ہم لوگ صوفیہ رٹمن کے اس قانون کے خلاف ووٹ اس کو ہرانے کے لیے نہیں ڈال رہے۔ ہم اپنا اختلاف اپنا احتجاج ریکارڈ کروانے آئے ہیں۔ ہم تھوڑے ہیں مگر ہم ناں میں ووٹ دے کر سارے ملک کو پیغام دینے آئے ہیں کہ یہ جو ہورہا ہے یہ غلط ہے.... ہمارے رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہی سکھایا ہے کہ اپنی کم تعداد سے گھبرائے بغیر ہم نے غلط کو غلط کہنا ہے.... اور اگر ہم یہ کہنا سیکھ لیں تو ہم میں سے ایک ایک مخالف کے دس دس پہ بھاری ہوگا۔ کیونکہ صوفیہ رٹمن صاحبہ صرف اپنی اور اپنے والد کی کرپشن کو چھپانے کے لئے....“

ہال میں شور گونجنے لگا.... تا دہی فقرے.... نعرے.... وان فاتح بھی مزید اونچا بولنے لگا.... ”اور اپنی چوری کو بچانے کے لئے....“ (حکومتی ارکان جگہوں سے کھڑے ہو گئے) ”روزنت نئے بل لے آتی ہیں.... تاکہ لوگوں کو بے وقوف بنا سکیں....“ (لوگ کھڑے کھڑے ڈیسک بجانے لگے جس کا مطلب احتجاج تھا۔ فاتح کی آواز مزید بلند ہو گئی اور گردن پہلے سے زیادہ اونچی)

”مگر پردھان منتری صاحبہ.... یاد رکھیے گا... جب تک وان فاتح رامنزل زندہ ہے.... وہ آپ سے آپ کی چوری کا حساب مانگتا رہے گا.... اور ایک دن آپ کو اس ملک میں سرچھپانے کی جگہ نہیں ملے گی۔“

کسی نے بل کی کاپیاں ہوا میں اڑائیں... کسی نے فائلیں نیچے گرائیں.... اپوزیشن کے ساٹھ اراکین کاغذ اچھالتے ہوئے نعرے بھی لگا رہے تھے...

”اور اسی کے ساتھ ہم اس بل کی مخالفت میں ایوان سے واک آؤٹ کرتے ہیں۔“ کہہ کے وہ مائیک پہ جھکا اور ڈیسک پہ دو دفعہ زور سے ہاتھ مارا پھر سیدھا ہوا اور نشست کے پیچھے سے نکل آیا۔ اس کا رخ باہر کی جانب تھا۔

بارین نیشنل کے اراکین کاغذوں کے پرزے اچھالتے اس کی معیت میں دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ حکومتی اراکین شور کر رہے تھے اور اسپیکر مسلسل ”بیٹھ جائے، ایسے نہ کیجئے۔“ کہہ کے معاملہ سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اپوزیشن اراکین باہر نکلے تو وہاں کھڑے رپورٹرز دھڑ دھڑ تصاویر کھینچنے لگے۔ فاتح جو سب سے آگے تھا، مسکرا کے ہاتھ فضا میں ہلاتا آگے بڑھ گیا۔

”مسز عصرہ کا فون ہے سر!“ وہ راہداری میں چلتا جا رہا تھا جب عثمان نے اپنا فون اسے لا دیا۔ فاتح نے فون کان سے لگایا۔ ”کیا ہوا؟“

”تمہیں کال کر رہی تھی، تم اٹھا نہیں رہے تھے۔ فائل کا کچھ پتہ چلا۔“ وہ فکر مند لگ رہی تھی۔

”تمہارے بھائی کو بہتر پتہ ہوگا۔“ وہ لفٹ میں داخل ہوا۔

”وہ تالیہ... جاتے ساتھ اشعر کو بتائے گی اور اشعر بہت برا منائے گا کہ ہم نے تالیہ پہ شک کیا۔“

”شک کیا؟ مجھے یقین ہے یہ اسی کا کام ہے۔“ وہ تلخی سے کہہ رہا تھا۔ لفٹ نیچے جا رہی تھی۔ عثمان خاموشی سے ساتھ کھڑا تھا۔

”کیا ہم اور بیجنل فائل دوبارہ نہیں نکلوا سکتے؟ جب گھر تمہارے نام رجسٹرڈ ہے تو مسئلہ کیا ہے؟ وہ فائل اگر ایش نے چوری بھی کروائی ہے تو اب وہ تو ہمیں نہیں ملنی۔“

”بہت وقت لگ جائے گا اس میں۔ خیر میں مصروف ہوں۔ گھر آ کے بات کرتا ہوں۔“ اس نے فون عثمان کی طرف بڑھا دیا۔

اب وہ اکتایا ہوا لگنے لگا تھا۔

”فارض کو ڈھونڈو۔ اس سے کہو مجھ سے پارکنگ میں ملے۔ ہرنوں کے پاس۔“ کچھ سوچ کے بولا تو عثمان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

لفٹ کے دروازے کھلنے کو تھے۔ فاتح نے چہرے پہ وہی مسکراہٹ طاری کر لی۔

سیاستدان کا بزنس فیس....

☆☆=====☆☆

بازار میں سرخ اینٹوں کی روش بنی تھی جس پہ بھیڑ کے درمیان وہ دونوں چلتے جا رہے تھے۔ سفید ہیٹ پہنے سنہری چوٹی آگے کو ڈالے تالیہ آگے تھی اور ایڈم پیچھے۔ وہ جس جارحانہ انداز میں جا رہی تھی ایڈم بار بار اس کا غصیلا چہرہ دیکھ کے سوچتا کہ یہ تو جاتے ساتھ ہی جیولر کی گردن دبوچ لے گی....

جیولر اسٹور پہنچتے ہی تالیہ سیدھی اندر گھس گئی۔ ایڈم پیچھے لپکا۔ شوکیس کے پیچھے ایک آدمی بیٹھا تھا۔ تالیہ کو دیکھ کے وہ خوش اخلاقی سے مسکرا کے اٹھا۔ ”السلام علیکم میڈم!“ کہیں پیچھے تیز سنکھے چلنے کی آواز آرہی تھی۔

”وعلیکم السلام انکل۔ یہ میرا بھائی ابھی آپ سے انگوٹھی لے کر گیا تھا۔ بہت ہی جلد باز ہے یہ۔ مجھے بتائیے میں اس کا کیا کروں؟ آخر یہ کب بدلے گا؟“ وہ کرسی پہ بیٹھتے ساتھ ہی شروع ہو گئی۔ دوستانہ لہجہ قدرے ہچکناہ آواز۔ ایڈم محمد نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ بالکل بھی غصے میں نہیں لگ رہی تھی۔ ”اب دیکھیں نا.... ہماری ماں کا سکہ ہی بیچ دیا وہ بھی اپنی بیوی کے لئے۔ جس دن سے اس کی شادی ہوئی ہے ہم بہن بھائی تو مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ اب بتائیں میں ماں کو کیا جواب دوں گی؟“ معصومیت سے پوچھتے ہوئے پلکیں جھپکیں۔

”وہ سکہ تو ہم نے پگھلا دیا میم۔“ سیلز مین متانت سے اس کے مقابل کھڑے بولا۔

”ان چے (مسٹر)....“ وہ آگے کو ہوئی اور بے بسی بھری معصومیت سے بولی۔ ”وہ سکہ ہمارے لئے بہت قیمتی ہے۔ ہمارے دو چھوٹے چھوٹے اکلوتے ماں باپ ہیں۔ وہ شدید ناراض ہوں گے۔“ ایڈم بس کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ منہ کھولے۔

”میم.... وہ صحیح کہہ رہا ہے سکہ ہم نے پگھلا دیا ہے۔ ہم آپ کی رقم واپس کر سکتے ہیں مگر سکہ نہیں۔“ ایک ادھیڑ عمر صاحب کو نے سے اٹھ کے اس طرف آئے تو تالیہ نے مسکرا کے گردن موڑی اور دلچسپی سے ان کو دیکھا۔ پھر ہیٹ اتار کے شوکیس پہ رکھا۔

”آپ نے ناشتے میں انڈا کھایا تھا کیا؟“

ان صاحب نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ ”جی؟“

”آپ کی شرٹ پہ ادھر انڈے کا داغ لگا ہے۔ شاید آپ ناشتے کے بیچ میں تھے جب آپ کے اس ملازم نے آپ کو کال کر کے بتایا کہ ایک بے وقوف (ایڈم کی طرف اشارہ کیا) ایک اینٹیک سکہ لے کر آیا ہے اور آپ بھاگے بھاگے چلے آئے۔ جیولر اور اتنے آرام سے اینٹیک پگھلا دیں میں کیسے مان لوں ہوں؟“ پھر سے پلکیں جھپکیں۔

”بیٹے مجھے واقعی سکے کی تاریخی اہمیت کا علم نہیں۔ ہم فوراً سونا پگھلا دیتے ہیں اور وہ اس نے میرے سامنے پگھلا دیا ہے۔“ وہ پکے رہے۔

تالیہ نے کہنی شوکیس پر رکھی اور ہتھیلی پہ گال جمایا۔ ”میں پولیس کو بلا لوں، انکل؟“
 ”ہم نے قانونی طریقے سے انگوٹھی بنائی ہے، بل وغیرہ سب ہمارے پاس ہے۔ پولیس کیا کرے گی بیٹا؟“
 ”نہیں انکل، انگوٹھی کے لئے نہیں۔ ان پنکھوں کے لئے۔“ اس نے مسکرا کے ابرو سے اشارہ کیا۔ سب کی گردنیں مڑیں۔ کونے میں ایک دروازہ تھا جو دکان کے اندر کھلتا تھا۔ ادھیڑ عمر یلز مین کے ابرو اکٹھے ہوئے۔ ”کیا مطلب؟“
 ”یہ دکان بالکل کونے میں ہے۔ الگ تھلگ سی۔ اور اس کے ہیمنٹ سے پنکھوں کی آواز آرہی ہے۔ آپ نے ہیمنٹ میں پنکھے کیوں چلا رکھے ہیں؟ ہوں۔ مجھے سوچنے دیں۔“ ہتھیلی پہ گال رکھے آنکھیں بند کر کے سوچا پھر کھول کے مسکرائی۔
 ”نیچے تہہ خانے میں... جڑی بوٹیاں اگاتے ہیں آپ ہے نا... نشہ آور بڑی بوٹیاں... ڈرگز... ان کی بو یہاں تک آرہی ہے مجھے۔ تمہیں آرہی ہے نا، بھائی؟“

ایڈم نے محض مرا ثبات میں ہلایا۔ وہ بالکل چپ ہو گیا تھا۔ دونوں دکانداروں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔
 ”اب بازار کے لوگ تو آپ سے ڈرتے ہیں، کسی کو بتاتے نہیں، لیکن میں تو نہیں ڈرتی، میں تو پولیس کو بلا سکتی ہوں۔ ہاں لیکن میں اتنی بری نہیں ہوں۔ کیوں آپ کے رزق پہ پیر ماروں۔ اس لئے....“ دوسری ہتھیلی سیدھی پھیلائی۔ ”میرا سکہ میرے ہاتھ پہ رکھ دیں اور سمجھیں کہ ہم نے آپ سے کبھی کچھ لیا ہی نہیں۔“

ادھیڑ عمر دکان کا مالک چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر لڑکے کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کے اندر چلا گیا۔ واپس آیا تو ہتھیلی ہاتھ میں تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے تالیہ کے ہاتھ پہ رکھتا، ایڈم نے ”شکریہ“ کہہ کے وہ اس سے لے لی۔
 ”یہ واپس لے لیجیے۔“ سنجیدگی سے اس نے انگوٹھی والا بیگ پرے دھکیلا۔
 ”ارے میں اس کی ہیمنٹ کرتی ہوں۔“ تالیہ نے پرس کھولا مگر وہ باہر جا رہا تھا۔
 ”ضرورت نہیں۔“ وہ خشک لہجے میں کہہ کے نکل گیا تو تالیہ سنبھل کے مسکرائی اور ”تھینک یو انکل“ کہتی اس کے پیچھے لپکی۔
 وہ باہر روش پہ چلتا جا رہا تھا۔ سنجیدہ خاموش۔

”تمہارے موڈ کو کیا ہوا ہے؟“ ایڈم نے ایک خفا نظر اس پہ ڈالی۔

”آپ نے ایک ہی سانس میں اتنے سارے جھوٹ بول دیے۔“

”کیا تم نے نور سے جھوٹ نہیں بولا تھا کہ میں نے تمہیں تحفے دے کر بھیجا ہے؟“ وہ سنجیدگی سے بولی تو ایڈم نے مڑ کے اسے

دیکھا۔

سینے پہ بازو لپیٹے سر پہ ترچھا ہیٹ رکھے وہ اندروالی بچگانہ سادہ لڑکی سے مختلف نظر آرہی تھی۔

”جی آپ کی وجہ سے جھوٹ بولنا پڑا تھا مجھے۔ لیکن آپ نے ایک ڈرگز کے چلتے کاروبار کو نظر انداز کر دیا اس سکے کے پیچھے۔“
”تو میں کیا کر سکتی تھی؟“

”آپ پولیس آفیسر ہیں ان کو گرفتار کرتیں اور سکہ برآمد کر لیتیں۔“

”یہ میرا ڈیپارٹمنٹ نہیں ہے۔ جو کام ضروری ہوتا ہے اس پہ فوکس کیا جاتا ہے ہاں۔“ وہ روش کے درمیان میں کھڑے تھے۔
لوگ ان کے اطراف میں آ جا رہے تھے۔ دھوپ تیز ہو رہی تھی۔

”مگر آپ.... آپ اتنی آسانی سے جھوٹ کیسے بول لیتی ہیں؟“

”I Lie for a Living!“ وہ سنجیدگی سے اس کے زچ چہرے پہ نظریں جمائے بولی۔ ”اب مجھے یہ سکہ دوتا کہ میں اس کو سرکار کو لٹاؤں اور تمہارا بونس تمہیں دلاؤں۔“ ہتھیلی پھیلائی۔

”کیا آپ واقعی پولیس آفیسر ہیں؟ یونو میں فورسز میں تھا۔ تھوڑا بہت میں بھی جانتا ہوں ان چیزوں کے بارے میں۔“

”اوہ۔“ تالیہ کے ابرو بھنچے۔ ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ ”تم مجھ پہ شک کر رہے ہو۔ ٹھیک ہے۔ کرو شک۔ بلکہ ایسا کرو یہ سکہ بھی تم ہی رکھ لو۔ میں رپورٹ لکھ دوں گی اور اس کیس سے الگ ہو جاؤں گی۔ آگے ڈیپارٹمنٹ جانے اور تم جانو۔“

کہہ کے وہ غصے سے آگے بڑھ گئی تو وہ کچھ خفا، کچھ الجھا ہوا مڑا۔ ”چے تالیہ!“

تالیہ تیور کے گھومی اور انہی برہم آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ”تمہیں بھی جیولر کی طرح سکے کا لالچ آ گیا ہے تم اپنے لئے رکھنا چاہتے ہو تو شوق سے رکھو۔ اگر مجھ پہ اعتبار نہیں تو جو چاہے کرو۔ ہاں اگر اعتبار آ جائے تو مجھے فون کر لینا۔ مجھے اور بھی کام ہیں۔“ پھر وہ کی نہیں۔ تیز تیز آگے بڑھ گئی۔ ایڈم نے اسے نہیں پکارا۔ وہ شش و پنج میں کھڑا رہا۔

بازار سے باہر نکلتے ہوئے اس نے داتن کا نمبر ملایا اور موبائل کان سے لگائے کار کی طرف آئی۔ اب وہ قدرے پریشان لگ رہی تھی۔

”سکہ مل گیا ہے مگر وہ ایڈم کے پاس ہے۔ ایڈم کو مجھ پہ شک ہو رہا ہے۔ نہیں میں اس سے وہ چرا نہیں سکتی۔ اس کو چرایا نہیں جا سکتا۔ فی الحال ایڈم اس کا مالک ہے اور اسے وہ مجھے اپنی مرضی سے دینا ہو گا۔ اس کا شک کم ہو تو وہ مجھے کال کر لے گا نہیں تو کوئی اور حل سوچتی ہوں.....“

وہ کار میں بیٹھتے ہوئے کہہ ہی رہی تھی کہ مانوس سی رنگ ٹون سنائی دی۔ وہ چونکی۔ پھر جلدی سے پرس کھولا اور سیاہ سیل فون نکالا۔

حالم کافون جس کی اسکرین پہ فارض کا نمبر چمک رہا تھا۔ تالیہ نے گہری سانس لی۔ اور داتن کافون کاٹ دیا۔
 ”سنہرے بالوں والی ساری لڑکیاں خالی دماغ کی نہیں ہوتیں تو انکو! اب وہ وقت آ گیا ہے کہ آپ یہ بات سمجھ لیں۔“
 تلخی سے مسکرا کے بڑبڑائی اور فون کان سے لگالیا۔ ”بولو فارض۔“

☆☆=====☆☆

پار لیمان کے اونچے ناور کے عقب میں ایک سبزہ زار بنا تھا جس کے گرد باڑ لگی تھی۔ اس کو ہرنوں کی پارکنگ کہا جاتا تھا۔ بہت سے کن چیل اور ہرن وہاں ٹہل رہے تھے۔ ایک زمانے میں چینی پارلیمنٹ اسپیکر ملایشیاء کے دورے پہ آئے اور ہرنوں کا تحفہ لائے۔ یہ سارے ہرن انہی کی اولاد تھے اور یہیں رکھے جاتے تھے۔

فارض صاحب باڑ سے ٹیک لگائے منتظر کھڑے تھے جب انہوں نے وان فاتح کو سامنے سے آتے دیکھا۔ وہ تنہا آ رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے۔ عثمان یا گارڈز کے بغیر۔
 ”کیا آپ نے اپنا ذہن بدل دیا؟“

”میں تمہارے انویسٹی گیٹر کو ہار کرنا چاہتا ہوں، لیکن catch (معاملے کا منفی رخ) کیا ہے؟“ مسکرا کے پوچھتے وہ باڑ کے قریب آیا۔ دھوپ سارے کو جھلسا رہی تھی، ایسے میں ایک درخت تلے مادہ ہرن تین ننھے غزالوں کو لئے سستانے بیٹھی تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں سے وہ چاروں ان دو ممبرز پارلیمنٹ کو آمنے سامنے کھڑے گفتگو کرتے دیکھ رہے تھے۔
 ”کیچ؟“ فارض نے اچنبھے سے پوچھا۔

”کم آن فارض۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ بلیک مارکیٹ کے کسی انویسٹی گیٹر کو ہار کیا جائے اور کوئی کیچ نہ ہو۔“
 ”وہ قانونی طریقے سے کام کرتا ہے لیکن وہ رجسٹرڈ نہیں ہے، اپنا چہرہ نہیں دکھاتا، اور پیسے Bitcoin کے ذریعے لیتا ہے۔ Bitcoin لیگل ہوتا ہے۔“ (یہ ایک ڈیجیٹل کرنسی ہوتی ہے جو ٹریس نہیں کی جاسکتی۔)
 فاتح گردن موڑ کے دور سڑک کو دیکھنے لگا۔ اونچی عمارتیں... سڑک.... دور تک پھیلا سبزہ۔ ہرن ابھی تک اسے دیکھ رہے تھے اور وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر چہرہ واپس موڑا۔

”ٹھیک ہے۔ اسے کال ملاؤ۔“ فارض نے فوراً فون نکالا اور نمبر ملا یا۔

”وان فاتح تم سے بات کرنا چاہتے ہیں،“ عالم، اور پھر موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔

”السلام علیکم!“ اپنی بھاری آواز میں فاتح بولا تو دوسری جانب لمحے بھر کو خاموشی چھا گئی۔ پھر مردانہ آواز ابھری۔

”سوچ رہا ہوں سیاستدان پہ سلامتی واپس بھیجوں یا نہیں، کیونکہ آپ لوگ پیٹھ میں چھرے گھونپنے کے لئے مشہور ہوتے ہیں۔“

لیکن خیر... آپ مختلف دیکھتے ہیں اس لئے وعلیکم السلام، وان فاتح رامنزل۔ بتائیے..حالم آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔“
فاتح نے گہری سانس لی۔ ”کم از کم سیاستدان میں لوگوں کو فیس کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے، حال، وہ انکپٹڈ فون سے مشینی آواز میں بات نہیں کرتے۔“

”مجبوری ہے، جناب، آپ کی حکومتیں میرے جیسے لوگوں کی کمائی سے ٹیکس کاٹنے کے درپے ہوتی ہیں۔ اپنی اصل آواز کا رسک نہیں لے سکتا۔“

”ہوں۔ خیر تم بتاؤ... تم کیا کر سکتے ہو میرے لئے؟“ وہ اب آنکھیں چھوٹی کر کے دوسرے کپڑے پہ جمائے ہوئے تھا۔ مادہ ہرن ابھی تک بڑی بڑی آنکھوں سے اس کو دیکھتے جا رہی تھی۔ اس کے بچے البتہ گھاس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”یہ تو منحصر ہے اس پہ کہ آپ مجھ سے کیا کروانا چاہتے ہیں!“

”میرے گھر سے کل رات ایک فائل چوری ہوئی ہے۔“

”دیا پارک سٹی والے گھر سے؟“ اس نے پروفیشنل انداز میں پوچھا گویا معلومات نوٹ کر رہا ہو۔ فاتح نے خود کو آرام دہ محسوس کیا۔

”ہاں۔ میرے کمرے کے لاکر سے۔“

”سیف کون سا ہے آپ کا؟“

”فارسیف۔“

”وہ تو ریراتھ میگنیٹ سے پانچ سینڈ میں کھل جاتا ہے، پاسورڈ کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ خیر... چوری کیا ہوا ہے؟“

”ایک فولڈر جس میں ڈاکومنٹس تھے۔“

”اس کی پہچان؟“

”نیلے رنگ کا ہے۔ میرے ملاک والے گھر کے کاغذات تھے۔ مجھے وہ ضروری چاہیے ہیں۔“ لمحے بھر کے لئے خاموشی چھا گئی۔

جیسے حال چوڑکا ہو۔ ”سن باؤ کا گھر؟“ تیزی سے پوچھا۔

”ہاں... وہی گھر۔“

”آخری دفعہ کاغذات کب دیکھے آپ نے؟“ حال سنبھل گیا تھا۔

”کل صبح۔“

”اور چوری کا علم کب ہوا؟“

”آج صبح جب میں نے اپنا لاکر کھولا۔“

”یعنی چوبیس گھنٹے کی ونڈو ہے جس میں کسی نے آپ کا لاکر کھول کے پیپرز نکالے۔ کوئی نشان، کوئی زور زبردستی کے آثار؟ ملازموں کو ز دو کو ب کیا گیا ہو؟“ اس کے سوالات فاتح کو مزید آرام دہ کر رہے تھے۔

”اوپہوں۔ صفائی سے کام کیا گیا ہے۔ کسی کو علم بھی نہیں ہوا۔“

”اور کب تک واپس چاہیے ہیں ڈاکومنٹس؟“

”کل صبح تک۔“

”مل جائیں گے۔“ وہ اتنے آرام سے بولا تو فاتح ہلکا سا حیران ہوا۔

”اتنی جلدی کیسے ڈھونڈو گے تم؟“

اس کی حیرت پہ ساتھ کھڑے فارض صاحب تفاخر سے مسکرائے جیسے اپنے انتخاب پہ فخر ہوا ہو۔

”وان فاتح.... کبھی کوئی میجک شو دیکھنے گئے ہیں آپ؟“

”شاید۔“ اس نے شانے اچکائے۔

”لوگ جادوگروں کے تماشے دیکھنے کیوں جاتے ہیں؟ حیران ہونے کے لئے.... دھوکہ کھانے کے لئے... amazed ہونے کے لئے۔ اگر جادوگر آپ کو amaze نہیں کر رہا، اگر وہ آپ کو دھوکہ نہیں دے پارہا، اگر آپ کو اس کی ٹرک پہلے سے معلوم ہوگئی ہو تو وہ اچھا جادوگر نہیں ہوتا۔ آپ بور ہوتے ہیں۔ آپ کو مزہ نہیں آتا۔ اس لیے آپ کو میرا طریقہ کار معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ میرے پاس دھوکہ کھانے آئے ہیں حیران ہونے، ٹرکڈ ہو جانے.... اگر آپ کی تشفی نہ ہو تو میں آپ سے پیسے نہیں لوں گا۔“

”چلو.... دیکھتے ہیں۔“ وہ مسکرایا۔ ”تمہارے پاس کل صبح تک کا وقت ہے۔“

”آخری سوال، آپ کو کسی پہ شک ہے؟ کون یہ کام کر سکتا ہے۔“

”تم جادوگر ہو، تم اپنے جادو سے خود معلوم کرو کہ کون یہ کر سکتا ہے۔“ وہ جیسے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”پھر جادو دیکھنے اور سہنے کے لئے تیار ہو جائیے، وان فاتح!“ حال کا جواب اسی کے انداز میں آیا۔ ”اور ہاں... اگلی دفعہ مجھے

اپنے نمبر سے فون کیجیے گا۔ مجھے درمیانی لوگ نہیں پسند۔“

”اور تمہاری فیس!“

”وہ کام کے بعد ہوگی اور... میری مہارت اور آپ کی شخصیت کے مطابق ہوگی۔ خدا حافظ!“ کال کٹ گئی۔ فاتح کی مسکراہٹ

مزید گہری ہوئی۔ ستائشی انداز میں ابرو اچکا کے فون فارض کی طرف بڑھایا۔
 ”کون ہے یہ آدمی؟ آئی لائیک ہم!“

”جو بھی ہے کمال ہے!“ وہ بھی خوشدلی سے مسکرا کے بولے اور اس کے ہمراہ آگے کو چل دیے۔ واپس جاتے ہوئے فاتح کی مسکراہٹ قدرتی تھی۔ جیسے وہ خوشگوار سی حیرت میں گھر گیا ہو۔ جیسے عرصے بعد کسی سے بات کر کے اتنا لطف آیا ہو۔
 مادہ ہرن ابھی تک آنکھیں کھولے سپاٹ سی ان دو افراد کو دیکھ رہی تھی جو دور ہوتے جا رہے تھے۔
 دور بازار کے پارکنگ میں کار میں بیٹھی تالیہ نے سوگوار مسکراہٹ کے ساتھ فون بند کیا اور انکیشن میں چابی گھمائی۔
 ”عصرہ کو ایک واضح پیغام دینے کا وقت آ گیا ہے۔“ اس نے سن گلاسز آنکھوں پہ چڑھائے اور کار سڑک پہ ڈال دی۔

☆☆=====☆☆

وہ دورویہ سرمئی سڑک تھی۔ دونوں اطراف لکڑی کی اونچی شاہس اور ریسٹوران بنے تھے۔ یہ کسی زمانے میں دو منزلہ گھر ہوتے تھے اب جدید تراش خراش کے بعد ان کو دوکانوں میں بدل دیا گیا تھا۔ عصرہ کی گیلری بھی انہی میں سے ایک تھی۔
 گیلری کے اندر کھلا سا ہال بنا تھا۔ کسی شاپنگ مال کی طرح بالائی دونوں منزلوں کی بالکونیاں یہاں سے نظر آتی تھیں۔ چھت بہت اونچی تھی۔ سیاح آگے پیچھے ٹہلتے ہوئے نور دات دیکھ رہے تھے۔
 عصرہ کا آفس دوسری منزل پہ تھا مگر اس وقت وہ آفس میں نہیں تھی۔ وہ اسٹورج روم میں اپنی نگرانی میں سامان کو پیک کروا رہی تھی۔ ارد گرد اسٹاف کام میں لگا دکھائی دیتا تھا۔
 ”سیکیورٹی ٹیگڈ کو ڈبل چیک کریں۔ انچے وکرم۔۔۔“ اس نے مڑ کے ایک انڈین شخص کو پکارا۔ (جیسے بچے سے مراد ”مس“ تھا ویسے ہی ”ان بچے“ سے مراد سڑ تھا۔) ”آپ سے میں یہ توقع کرتی ہوں کہ میرے کسی آرٹ پیس کو نیلامی کی جگہ پہنچنے سے قبل آنچ بھی نہیں آئے گی۔“

”میم! تالیہ بہت مراد آئی ہے۔“ سیکرٹری نے اندر جھانکا تو عصرہ بری طرح چونکی۔ پھر گہری سانس لی۔
 ”اس نے آنا ہی تھا۔ اسے میرے آفس میں بٹھاؤ۔ میں نہیں چاہتی کہ جب وہ مجھ پہ چپے چلائے تو باہر کے لوگ اس کی آوازیں سنیں۔“

”آفس میں ہی بٹھایا ہے لیکن وہ چپے گی کیوں؟ وہ تو گیلری کے بڑے ڈونرز میں سے ہے۔“ سیکرٹری الجھی۔
 ”فاتح نے اس کی صبح بے عزتی کی ہے۔ مجھے لجاجت سے اس سے معذرت کر کے یہ معاملہ ختم کرنا ہوگا۔“ عصرہ نے پرس سے ننھا آئینہ نکالا اسفنج سے ناک اور گال پہ میک اپ درست کیا۔ کوٹ کو نیچے کھینچ کے شکلیں درست کیں پھر چہرے پہ فکر مندی کے

تاثرات ڈالے اور باہر نکل آئی۔

ہال عبور کر کے وہ اوپر آئی تو اچھی خاصی فکر مند لگ رہی تھی۔ تالیہ کو دروازے کی طرف پشت کیے بیٹھے دیکھا تو اندر قدم رکھتے ہی شروع ہوئی۔ ”آئی ایم سو سوری تالیہ.... مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میرے پیچھے یہ سب ہو جائے گا اور تم....“ وہ اپنی سیٹ کی طرف آتے ہی بے حد دکھ انداز میں کہہ رہی تھی کہ....

”السلام علیکم مسز عصرہ.... میں اچھی خبر لائی ہوں۔“

تالیہ مراد خوشگوار چہرے کے ساتھ چہکی تو عصرہ کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ وہ ٹھہر کے تالیہ کا چہرہ تنکے لگی۔

وہ صبح والا سفید کوٹ پہنے ہوئے تھی سنہری چوٹی آگے کو ڈالے سر پہ بیٹ تر چھار کھے، گلابی گالوں والی پیاری سی لڑکی مسکراتے ہوئے بہت پر جوش لگ رہی تھی۔

”میری کانگ ہو سے بات ہوئی ہے وہ سکوں کی شرط رکھے بغیر بھی آنے کو تیار ہیں اور آپ جانتی ہیں کانگ ہو کے آنے کا مطلب ہے وہ دو تین بڑے ڈونرز کو ساتھ میں لائیں گے۔ میں سوچ رہی تھی کہ.... آپ کھڑی کیوں ہیں؟ بیٹھ جائیں۔“

آخر میں ذرا حیرت سے بولی تو ششدر کھڑی عصرہ سنبھلی پھیکا سا مسکرائی اور اپنی پاؤں سیٹ پہ بیٹھی۔ آنکھیں ابھی تک حیران اور الجھی ہوئی تھیں۔

”اچھا صبح میں نے پینٹنگ کو فائنل ٹچ دے دیا تھا۔ یہ ایک کار پینٹنگ شاپ کا ایڈریس ہے۔“ ایک کارڈ میز پہ رکھا۔ ”ہے تو پرانی چھوٹی سی شاپ مگر آپ کے پورٹریٹ کی اس آدمی سے لا جواب فریمنگ کوئی نہیں کر سکتا۔ چونکہ نیلامی سر پہ آن پہنچی ہے آپ اس کو آج ہی بلوا لیجیے گا۔“

”شیور!“ عصرہ زبردستی مسکرائی۔ تشویش بھری آنکھیں تالیہ پہ جمی تھیں۔ ”صبح میں گھر واپس آئی تو پورٹریٹ دیکھ لیا تھا... مگر تم جا چکی تھیں۔ ملازم بتا رہے تھے کہ فاتح نے شاید تم سے بات وغیرہ کرنی تھی؟ میرے آنے تک وہ بھی جا چکا تھا ملاقات نہیں ہو سکی۔“ وہ غور سے اسے دیکھتے سرسری سا بولی گویا پانی کی گہرائی ماپنی چاہی۔

تالیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ مسکراہٹ برقرار تھی۔

”جی انہوں نے مجھے اسٹڈی میں بلوایا تھا۔ آپ کو تو معلوم ہے وان فاتح کا کیرز ماور سحر ہی اتنا ہوتا ہے کہ میں تو سارے الفاظ ہی بھول جاتی ہوں۔ کہاں سوچا تھا میں نے کہ میں وان فاتح کے سامنے بیٹھ بھی سکوں گی۔“

عصرہ نے جبری مسکراہٹ کے ساتھ سر کو خم دیا۔ اچنبھے بھری آنکھیں تالیہ سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ ”خیریت سے بلایا تھا اس نے

؟“

”جی... کچھ زیادہ بات نہیں کی انہوں نے۔“ اس نے گویا لاعلمی سے شانے اچکائے۔ ”وہ مجھے ہانگ تو اکی کہانی سن رہے تھے۔ سارا جیو املا یو کی ایک داستان۔ میں تو ہر دفعہ اتنی شاراسٹرک ہو جاتی ہوں کہ ان کی آدھی بات سن ہی نہیں پاتی۔ اور ہاں...“ اس نے پیشانی کو چھو کے جیسے یاد کیا۔ ”انہوں نے مجھے کہا کہ اشعر صاحب کے پاس ان کی کوئی فائل ہے جو میں اشعر صاحب سے واپس لا دوں۔ میں تو بس ایس سر کرتی رہی ورنہ سب میرے سر سے گزر گیا۔ اب اشعر صاحب سے میری اتنی فرٹکنیس کہاں۔ پتہ نہیں وہ کیا کہہ رہے تھے بہر حال ان سے ملنا اور بات کرنا ہی اتنا آزر ہوتا ہے کہ بس۔“ آنکھیں میچ کے مسکراتے ہوئے کھولیں، جیسے بچے کسی بات کا مزہ لیتے ہیں۔

”خیر، مجھے کہیں جانا ہے تو آپ اس کارپینٹر کو بلوالیجیے گا۔ میں نے ایک فرنیچر کرٹک سے بات بھی کی ہے اگر وہ اگلے ہفتے ملائیشیا میں ہوئی تو وہ بھی اٹینڈ کر لے گی نیلامی۔ وہ اکثر یہیں ہوتی ہے۔“ مسکراتے ہوئے بیگ اٹھایا اور کھڑی ہو گئی۔ ”انشاء اللہ نیلامی پہ ملاقات ہوگی۔“

عصرہ نے بدقت سر اثبات میں بلایا۔ جگہ سے نہیں اٹھی۔ ”فاتح ذرا مختلف طبیعت کا ہے تو... آئی ایم شیور اس کی بات کا کوئی غلط مطلب نہیں ہوگا۔“

”کس بات کا؟“ وہ انجانے پن سے بولی تو آنکھوں میں سادگی تھی۔

عصرہ جبراً مسکرائی اور کارڈ اٹھالیا۔ ”کچھ نہیں۔ میں ابھی... اس کو... یلو ایتی ہوں رائٹ۔“

”صحیح!“ تالیہ مسکرا دی اور پھر باہر چلی آئی۔ نکلے ساتھ ہی چہرے کے تاثرات سنجیدہ ہو گئے۔ سیاہ چشمہ آنکھوں پہ چڑھا لیا اور گزرتے گزرتے راہداری میں رکھے فلور لیمپ کو پیر سے ٹھوکر ماری۔ لیمپ اوندھاز میں پہ آگرا۔ دو ورکرز لیمپ کی طرف دوڑے تھے۔ وہ آگے بڑھتی گئی۔

اندر عصرہ اپنے آفس میں دم سادھے بیٹھی تھی۔ چپ۔ بالکل چپ۔ تبھی کسی افتاد کی طرح سیکرٹری اندر داخل ہوئی۔

”مس تالیہ تو آپ سے اتنی اچھی باتیں کر رہی تھیں، مگر جاتے جاتے انہوں نے کارنر لیمپ کو گرا دیا۔“

”اچھی باتیں؟“ عصرہ نے سلگتی کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔ ”وہ صرف مجھے ایک پیغام دینے آئی تھی۔“

سیکرٹری کے لب حیرت سے کھل گئے۔ ”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہنے آئی تھی کہ وہ ان گیمز میں مجھ سے زیادہ اچھی ہے اور یہ کہ وہ ایک بہت خطرناک لڑکی ہے، مجھے اس سے ڈرنا چاہیے۔“

اس نے بے اختیار کینٹی چھوئی۔ ”یہ لڑکی کسی چیز کے پیچھے ہے۔ اسے کچھ چاہیے۔ یہ مجھے یہ بتانے آئی تھی کہ میں اسے روک نہیں سکتی۔“ وہ بے بسی بھرے غصے سے ہتھیلیاں آپس میں ملتی شدید ڈسٹرب نظر آرہی تھی۔

نیچے تالیہ مراد ہال عبور کرتی نظر آرہی تھی۔ ہیل کی ٹک ٹک سارے میں گونج رہی تھی۔

گیلری سے نکلتے ہی تالیہ نے پرس سے ایک ننھا ایئر بڈ نکالا اور کان میں ڈالا۔ پھر سیدھی کار کی طرف چلتی گئی۔
”تم کہاں تھیں تالیہ؟“ آلے سے داتن کی آواز گونجی۔

”میں عصرہ کو وارن کرنے گئی تھی۔ اور اب میں اس کے بھائی کے پاس جا رہی ہوں۔ تمہارا کام کہاں تک پہنچا؟“ وہ کار میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

”میں نے الارم کمپنی کی طرف سے جا کروان فاتح کے گھر سے ملحقہ اسٹریٹس کے کیمرے چیک کیے ہیں.... اور بوجھو مجھے کیا ملا؟“ داتن مزے سے کہہ رہی تھی۔ ”رات کو عصرہ چند منٹ کے لئے واک کرنے نکلی تھی اور اس نے جوگرز کی جگہ سینڈل پہن رکھے تھے۔ وہ کسی اسٹریٹ میں غائب ہوئی جہاں کیمرہ نہیں تھا اور دو منٹ میں ہی واپس آ گئی۔ اس کی شال میں مجھے لگتا ہے کہ اس نے فائل چھپا رکھی تھی۔“

”یعنی اس اندھیر کارنر میں اس نے فائل کسی کو ڈراپ کی؟“

”یہیٰ! اشعر کا کوئی آدمی ہوگا۔“

”کوئی ویڈیو.... کوئی تصویر جس میں وہ فائل دیتے دکھائی سے رہی ہو؟“

”نہیں تالیہ! لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ اشعر کے خاص بندوں کا فون ٹریس کرواؤں کہ وہ رات کو اس جگہ آئے تھے یا نہیں اور....“

”داتن ریلیکس.... ہم انویسٹی گیٹر نہیں ہیں۔ اس لئے کسی قسم کی تفتیش کی ضرورت نہیں ہے۔“ کار اشارت کرتے ہوئے وہ

سنجیدگی سے بولی تو داتن لمحے بھر کو خاموش ہو گئی۔

”تو پھر ہم نے کرنا کیا ہے؟“

”وہی جو ہمیں آتا ہے۔ یعنی چوری۔“ اس نے کار سڑک پہ ڈال دی۔ لمبی سرمئی سڑک اطراف میں درختوں کی لمبی قطار کے

باعث چھایا میں تھی۔

”لیکن ہمیں یہ کون بتائے گا کہ فائل کہاں ہے؟“

”اشعر بتائے گا۔“ اس نے گلاسز اتارے اور مسکرا کے اسٹیرنگ وہیل گھماتے موڑا۔

چند لمحوں بعد وہ سیاہ موبائل اسٹینڈ پہ لگائے اسپیکر آن کیے ہوئے تھی۔ فاتح کا نمبر ملا رکھا تھا اور گھنٹی جا رہی تھی۔

”ہیلو؟“ اس کی بھاری آواز کار میں گونجی تو تالیہ کے لبوں پہ تلخ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”غالباً فارض نے آپ کو میرا نمبر دے دیا تھا تبھی آپ نے کال اٹھالی ورنہ میں نے سنا تھا آپ غیروں کی کیا اپنوں کی کال بھی نہیں اٹھاتے۔“

دوسری جانب سے گہری سانس لی گئی۔ ”سنی سنائی سے زیادہ فرسٹ ہینڈ انفارمیشن پہ بھروسہ کیا کرو، عالم!“
(اور آپ نے عصرہ کی سن کے جو مجھ پہ الزام لگا دیا وہ؟) مگر بولی نہیں صبر کر گئی۔
”تو جادوگر کے شو کے لئے تیار ہیں آپ؟“

”ابھی تک تمہارا شو شروع نہیں ہوا کیا؟ تم نے تو صبح تک فائل واپس کرنی تھی۔“
”کوئی بھی جادوگر اپنے اسٹنٹ کے بغیر کرتب نہیں کھیلتا لیکن اسٹنٹ کے علاوہ بھی ایک چیز وہ کرتا ہے۔ حاضرین میں سے وہ کسی ایک کو بلاتا ہے اور اس کو کوئی کام کرنے کا کہتا ہے۔ کیا آپ کرتب کا حصہ بننا چاہیں گے؟“
”میں کسی سے احکامات نہیں لیتا، عالم!“ وہ بے نیاز تھا۔
”مگر اپنی فائل کے لیے آپ کو میرے حکم کی تعمیل کرنی ہوگی، جیسے حاضرین میں سے آیا شخص اسٹیج پہ آتے ہی جادوگر کے تابع ہو جاتا ہے۔“

”عالم... اگر تمہیں یقین ہے کہ تم میرا وقت ضائع نہیں کر رہے تو میں یہ کروں گا، ورنہ مجھے ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔“
”آپ نے مجھے ایک بہت چھوٹا دورانیہ دیا ہے کام کا۔ اس لئے آپ کو میری بات ماننی پڑے گی۔ کچھ دیر بعد میں آپ کو ٹیکسٹ کروں گا، عین اسی وقت آپ ایک کام کریں گے۔“

وہ ساری تفصیل بتاتی گئی۔ عالم کا روایتی گھمنڈی انداز سمجھانے والے انداز میں بدلتا گیا۔ یہ پہلا کلائنٹ تھا۔ جس کے لئے لہجہ نرم ہوا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اس کے سامنے سر اور دل دونوں جھک جاتے تھے۔ وہ تو انکو تھے۔
”شیور۔ میں کر دوں گا۔ لیکن ٹیکسٹ مت کرنا، میرے فون پہ رنگ کرنا۔ میں میننگ میں ہوں تو فون نہیں دیکھتا۔“ وہاں ازلی بے نیازی کا وہی عالم تھا۔

”رائٹ، سر!“ وہ ضبط سے بولی اور اسٹینڈ پہ لگے فون کی اسکرین پہ انگلی پھیری۔ کال ختم ہو گئی۔ منہ میں کچھ بڑبڑا کے سر جھٹکا اور نظریں سڑک پہ جمادیں۔

☆☆=====☆☆

ایڈم محمد اس سکے کو جیب میں لئے جانے کتنی دیر سڑکوں کی خاک چھانتا رہا تھا۔ گھر آیا تو ننھا باغیچہ گرمی میں جھلس رہا تھا۔ مرغی ڈر بے میں کسی کونے میں چھپی بیٹھی تھی۔ پھول مرجھائے ہوئے لگ رہے تھے۔ وہ تھکا ماندہ اندر داخل ہوا تو ماں راہداری میں کچن

کے دروازے پہ کھڑی نظر آئی۔ اسے دیکھ کے آنکھوں میں حیرت ابھری۔

”تم جلدی آگئے۔ خیریت؟“

”عبداللہ خلاف توقع آج واپس آگیا ہے اس لئے میری چھٹی ہو گئی۔“

”مگر ایڈم... میری تو ابھی دس منٹ پہلے عبداللہ کی والدہ سے بات ہوئی ہے۔ عصرہ نے اس کو بلوایا تھا، مگر بس نہ ملنے کی وجہ سے

وہ کل صبح تک ہی آپائے گا۔“

ایڈم وہیں ٹھنک کے رک گیا۔ ”نہیں، مسز عصرہ نے کہا کہ وہ آچکا ہے۔ اسی لئے تو انہوں نے مجھے بھیج دیا۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ انہوں نے تمہیں کسی اور وجہ سے نہیں بھیجا؟“ ایبوتشولیش سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایڈم کا دماغ بھک سے

اڑ گیا۔

کیسی دنیا تھی یہ؟ کون سچا تھا؟ کون جھوٹا؟ وہ گم صم سا ہو گیا۔ پھر اٹنے قدموں باہر نکل آیا۔

برآمدہ دھوپ سے محفوظ تھا۔ وہاں چھایا تھی۔ وہ کرسی پہ بیٹھ گیا اور ننھے باغیچے کو دیکھنے لگا۔ پیرقینچی صورت میز پہ رکھ لئے۔ چہرہ

سوچ میں ڈوبا لگتا تھا۔

پھر اس نے فون نکال کے ڈرائیور کا نمبر ملا یا۔ ڈرائیور ساری سیاستوں اور اندر کی سازشوں سے بے خبر ہوتا تھا۔ نہ اس کا اتنا عہدہ

تھا نہ مقام کہ اسے کوئی شریک کرتا۔

”ایڈم تم آج آئے کیوں نہیں؟“ وہ اس کی آواز سنتے ہی شروع ہو گیا۔ ”فاتح صاحب پارلیمنٹ جاتے وقت ہمیشہ دو کپ کافی

کے پیتے ہیں۔ عثمان کو بھول گیا تھا اس نے صرف ایک دیا۔ یہ کیا طریقہ ہے۔“ اپنی طرف سے ڈرائیور نے رعب جھاڑا۔

”وان فاتح اس وقت کہاں ہیں؟“

”ابھی میں ان کو گھر لایا ہوں پھر یہاں سے ہم نے آگے جانا ہے۔ باڈی مین کا فرض بھی عثمان ادا کر رہا ہے۔ تمہارا پوچھا بھی تھا

فاتح صاحب نے۔“

”میں ابھی آتا ہوں۔ لیکن سنو۔“ وہ احتیاط سے پوچھنے لگا۔ ”آج گھر میں کچھ ہوا ہے کیا؟“

”کیا مطلب؟“

”کوئی غیر معمولی واقعہ؟ کوئی ایشو؟ میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ کہیں میری وجہ سے....“

”صبح فاتح صاحب کی اہم فائل چوری ہو گئی۔ ملازمہ بتا رہی تھی کہ صاحب نے وہ جو پینٹر لڑکی آتی ہے اس سے بھی پوچھ گچھ کی

ہے۔ صاحب بہت غصے میں تھے صبح۔ ادھر پارلیمنٹ میں سب کو پتہ تھا۔ دو تین ڈرائیورز نے تو مجھ سے بھی آکے پوچھا۔“

”چے تالیہ سے؟“ اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ”صاحب نے چے تالیہ سے پوچھ گچھ کی؟“

”ملازم کہہ رہے ہیں کہ صاحب کو شک ہے چے تالیہ نے ہی چوری کی ہے۔“ وہ اتنا باخبر تھا جتنا ہر ڈرائیور ہوتا ہے۔ ایڈم کے دماغ میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ”میں آتا ہوں“ کہہ کے فون رکھا اور باہر کو بھاگا۔

وان فاتح کی رہائش گاہ پہ گھنٹی بجاتے ہی گارڈ باہر نکل آیا۔ ”تمہارا کام ختم ہو چکا ہے ایڈم تم کیوں آئے ہو؟“ گارڈ کو شاید ایڈم کو اندر نہ آنے دینے کی ہدایت دی گئی تھی۔

”مجھے فاتح صاحب سے ملنا ہے۔“ وہ بے چینی سے بولا تھا۔

”ایسے تو صاحب نہیں ملتے۔ وہ بہت مصروف ہوتے ہیں۔“

”صرف پانچ منٹ کے لئے ملنے دو“ میں چلا جاؤں گا۔“ ابھی الفاظ منہ میں تھے کہ آٹومیٹک گیٹ کھلتا چلا گیا۔ ایڈم نے چونک کے دیکھا۔ فاتح کی کار باہر نکل رہی تھی۔ فاتح پچھلی سیٹ پہ سر جھکائے عینک لگائے، موبائل دیکھ رہا تھا۔ البتہ ڈرائیور نے ایڈم کو دیکھ کے کار آہستہ کر دی۔ ایڈم بھاگ کے فاتح کی کھڑکی تک گیا۔ بے چینی سے دستک دی۔ اس نے چونک کے سر اٹھایا، پھر بٹن پہ انگلی رکھی۔ شیشہ نیچے ہوتا گیا۔

”تم کہاں تھے صبح سے ایڈم؟“ اس نے سادگی سے پوچھا تو اگلی سیٹ پہ بیٹھا عثمان پورا گھوم کے تندہی سے بولا۔

”سر عبد اللہ نے پہنچ جانا تھا تو اس کو فارغ کر دیا۔“

”کیا میں نے تم سے پوچھا ہے عثمان؟“ وہ اسی سنجیدگی سے عثمان کو دیکھ کے بولا تو وہ چپ ہو گیا۔ فاتح نے گردن اس کی طرف موڑی۔ ”اور تم ٹھیک ہو ایڈم؟“

”جی سر!“ وہ جلدی سے بولا۔ ”سر عبد اللہ ابھی تک نہیں آیا، کیا میں آپ کے ساتھ جا سکتا ہوں۔“ وہ کار کی کھڑکی کو پکڑے کھڑا

تھا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے ایڈم۔ ایم فائن۔ ٹھینکس۔ خیال رکھو اپنا۔“ نرمی سے کہہ کے فاتح نے عینک اٹھالی تو ایڈم کو پیچھے ہونا پڑا۔ شیشہ اوپر ہوتا گیا۔ کار آگے بڑھ گئی اور وہ وہیں خالی ہاتھ کھڑا رہ گیا۔

”اب تم جاؤ۔“ گارڈ اس کے سر پہ آپہنچا۔ جیسے اسے نکالنے کی جلدی ہو۔ لیڈر جا چکا تھا۔ وہ رکتا بھی تو کس کے لئے۔

گرمی کی حدت بڑھ گئی تھی۔ وہ باہر سڑک کنارے چلتا گیا۔ ذرا سی دیر میں پسینے سے پورا بھیگ گیا تو ایک جگہ درخت تلے فٹ پاتھ پہ بیٹھ گیا۔ پھر جیب سے سکہ نکال کے دیکھنے لگا۔

وہ گول سنہری سکہ تھا جس کے دونوں طرف مظفرال سلطان لکھا تھا۔ اس نے سکہ مزید اونچا کی۔ اس کے گول دائرے کے ساتھ

نخنہ نخنہ حروف تھے جو مٹ مٹ کے ابھر رہے تھے.... ایڈم کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ دھوپ میں لمحے بھر کو وہ نظر آئے تھے۔ 1437۔ پھر وہ غائب ہوتے گئے۔ ایڈم بالکل سناٹے میں رہ گیا۔ یہ نظر کا دھوکہ نہیں تھا۔ یہ کوئی عجیب چیز تھی۔

اس نے جلدی سے سکہ ڈبے میں رکھ کے جیب میں ڈال دیا۔ پھر پریشانی سے سر پکڑ لیا۔

چپے تالیہ سے وہ پہلی دفعہ کب ملا؟ جب وہ اس سکے کو تنگو کامل کے گھراپنی جیب میں ڈال رہا تھا۔ چپے تالیہ نے دو ماہ وہاں کیوں نوکری کی؟ دو ماہ پہلے تو اسے نہیں معلوم ہوگا کہ وہ ان فاتح نے اس گھر مہمان بن کے آنا ہے۔ کیا وہ اس سکے کے پیچھے تھی؟ ایک نئے خیال نے اسے چونکا دیا۔

کیا یہ اس کا بار بار عصرہ کے گھر آنا.... یہ سب سکے کے لئے تھا؟ لیکن نہیں۔ وہ تو فاتح کی حفاظت پہ مامور ایک پولیس آفیسر تھی جس کو فاتح پہلے سے جانتا تھا تبھی اس کو تاشہ کہتا تھا۔ لیکن ایک منٹ... اگر وہ پہلے سے اس کو جانتا ہوتا تو چوری کے بارے میں تالیہ سے پوچھ گچھ کیوں کرتا؟ اتنی کڑی پوچھ گچھ کی ہوگی تو ملازم گواہ ہیں نا اس کے!

اس کا ذہن شک اور یقین کے درمیان ڈول رہا تھا۔ بالآخر اس نے موبائل نکالا اور تالیہ کے نمبر پہ ایک پیغام لکھا۔ ”ہم کب مل سکتے ہیں؟“ اور بھیج دیا۔

اب اسے جواب کا انتظار تھا۔

☆☆=====☆☆

دوپہر دھیرے دھیرے شام میں ڈھل رہی تھی البتہ گرمی اور جس ویسا ہی تھا۔ ایسے میں وہ نیلے شیشوں والا بزنس ٹاور سر اٹھائے کھڑا تھا جس کے انیسویں فلور پہ اشعر محمود کا آفس واقع تھا۔

انیسویں فلور پہ کشادہ سی لابی بنی تھی جس کے سامنے لفٹ کے دروازے اس وقت کھل رہے تھے اور تالیہ مراد باہر نکل رہی تھی۔ لباس بدل لیا تھا۔ گلابی قمیض پہ سیاہ منی کوٹ پہنے، کہنی پہ بیگ ڈالے، سنہری چوٹی کندھے پہ آگے گرائے اور سر پہ ترچھا سفید ہیٹ جمائے وہ باہر آئی اور ریسپشن ڈیسک کے قریب رکی۔

”تالیہ بنت مراد.... مجھے اشعر محمود سے ملنا ہے۔“

”جی، ان کا آفس بالکل کارز میں ہے۔“ لڑکی نے تہذیب سے گائیڈ کیا تو وہ ”ہوں“ کہہ کے نخریلی امیرزادیوں کی طرح آگے بڑھ گئی۔ کنکھیوں سے لابی کے صوفے پہ اخبار پھیلائے مطالعے میں منہمک داتن کو دیکھا مگر رکی نہیں۔

”فاتح وہ کردے گا نا جو تم نے کہا ہے؟“ داتن اخبار سامنے رکھے آہستہ سے بولی۔ کان میں لگا آلہ دور جاتی تالیہ کو آواز پہنچا گیا۔

”حالم کی بات کون ٹال سکتا ہے۔“ وہ بے پرواہی سے بولی۔ اب وہ راہداری کے دوسرے سرے تک پہنچ گئی تھی۔

اشعر کے آفس کے باہر بیٹھی سیکرٹری فوراً اٹھی۔ ”چے تالیہ...! اشعر صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

سیاہ منی کوٹ والی لڑکی نے پرس میں ہاتھ ڈالا اور سیاہ موبائل سے نمبر ملایا۔ دو گھنٹیاں اور کال کاٹ دی۔ اب وہ اشعر سے ملنے کے لیے تیار تھی۔

وہاں سے چند میل دور... ایک بین الاقوامی نشریاتی ادارے کے اسٹوڈیو روم میں وان فاتح موجود تھا۔ سیٹ لگا تھا، کیمرے سیٹ ہو رہے تھے۔ اینکرا اپنے کاغذات پڑھ رہا تھا اور فاتح مطمئن سا ٹانگ پہ ٹانگ جمائے کافی پیتے ہوئے سارا منظر نامہ دیکھ رہا تھا۔ تب ہی جیب میں رکھا فون تھر تھرایا تو اس نے نکال کے دیکھا۔ حالم کا نمبر دیکھ کے مسکرایا اور موبائل واپس رکھ دیا۔ پھر قریب کھڑے عثمان کو بلایا۔

”یہ کافی لے جاؤ۔ میں فریش ہو چکا ہوں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”خیریت سر؟“ عثمان نے مسکرا کے اس کا تازہ دم چہرہ دیکھا۔

”ہاں۔ صبح ایک انویسٹی گیٹر کو ہار کیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ فائل مل گئی ہے۔ اللہ کا شکر۔“

عثمان کا منہ کھل گیا۔ ”واقعی؟ اصلی فائل؟ کہاں سے ملی؟“

”جس نے چرائی تھی اس کے سیف سے۔“ مگ اس کی طرف بڑھا دیا اور سامنے دیکھنے لگا جہاں اینکرا اپنی نشست پہ بیٹھ رہا تھا۔

عثمان پھیکا سا مسکرایا۔ ”مبارک ہو سر!“ اور مگ لئے آگے بڑھ گیا۔

واپس اشعر کی آفس بلڈنگ میں آؤ تو لابی کے صوفے پہ بیٹھی بظاہر اخبار پڑھتی داتن دبی آواز میں ہونٹ کم سے کم ہلائے کہہ رہی تھی۔

”اب تک وان فاتح نے اپنے سیکرٹری کے سامنے فائل مل جانے کا ذکر کر دیا ہوگا۔ وہ فوراً اپنے اصل خداؤں کو بتائے گا، اور وہ پریشان ہو کے اس جگہ جائیں گے جہاں فائل رکھی ہے۔ میں اس کا پیچھا کروں گی اور یوں وہ خود ہمیں فائل تک لے جائیں گے اور ہم اس کو چرالیں گے۔“

تالیہ نے جواب نہیں دیا کیونکہ وہ اندر اشعر کے آفس میں بیٹھی تھی۔

آفس بہت روشن تھا۔ دو متصل دیواریں شیشے کی تھیں۔ وہ بلڈنگ کا کارنر آفس تھا (اونچی عمارتوں میں بنے آفسز کا بہترین آفس کارنر آفس ہوتا ہے جہاں ایک کے بجائے دو دیواریں شیشے کی ہوتی ہیں اور وہاں سے سارے شہر کا نظارہ کرنا بہت دلفریب لگتا ہے۔)

اشعر ٹیک لگائے اپنی کرسی پہ براجمان مسکرا رہا تھا اور سامنے تالیہ مراد سنجیدہ سی بیٹھی نظر آرہی تھی۔ ہیٹ سر پہ ترچھا رکھا تھا۔

”آپ کہیے چے تالیہ میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔“ وہ مسکرا کے بولا۔ گہری چھوٹی آنکھیں تالیہ کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”آپ ایک معزز انسان ہیں اور میں ایک سوشلائٹ اور آرٹ لور ہوں۔ کوالا پور کے آرٹ سے تعلق رکھنے والے حلقوں میں میرا ایک نام ہے، پہچان ہے۔ میرے کسی بھی قسم کے سیاسی عزائم نہیں ہیں، نہ مجھے سیاست میں دلچسپی ہے۔ اس لئے کل جو تصویر آپ نے ٹویٹ کی اس کے بعد سے مجھے موضوع گفتگو بنایا جا رہا ہے جو میرے لئے تکلیف کا باعث ہے۔“ وہ ڈسٹرب نظر آرہی تھی۔ اشعر کے چہرے پہ افسوس ابھرا۔

”جی مجھے بھی وہ سب بالکل اچھا نہیں لگا۔ اب تصویر اتارنا برا لگتا ہے، لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میڈیا کی تو عادت ہے بات کا بنگلہ بنانا۔“

”آپ کوشش کیجیے کہ اس کی سختی سے تردید کر دیں تاکہ میرے عزیز واقارب کو اس سب سے تکلیف نہ ہو۔ میرا آپ کی فیملی کا حصہ بننے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”تردید بات کو مزید اچھالتی ہے۔ آپ سیاست نہیں سمجھتیں، چے تالیہ۔ خاموش رہنا اور نظر انداز کرنا بہتر ہے۔“ وہ اب آگے ہو کے بیٹھا تھا سمجھانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

”میں اس سیاست کو سمجھنا بھی نہیں چاہتی، انچے اشعر۔ صبح وان فاتح نے بھی مجھے آپ کے حوالے سے باتیں کہیں جو مجھے اچھی نہیں لگیں۔ وہ کسی فائل کا ذکر کر رہے تھے پتہ نہیں کیا کہہ رہے تھے۔ براہ مہربانی آپ لوگ اپنی سیاست میں مجھے نہ دھکیلیں۔“ وہ سپاٹ انداز میں کہہ رہی تھی۔

”میں آبنگ کی طرف سے معذرت کرتا ہوں۔ وہ paranoid ہیں۔“ وہ نرمی سے کہنے لگا تو تالیہ نے خفگی سے سر جھٹکا۔

”مجھے سچ میں آپ کے باہمی مسائل میں دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے صرف آرٹ آپ کی فیملی کے قریب لایا ہے۔“

”تو آپ کو آرٹ پسند ہے؟“ وہ بات کو طول دیتے ہوئے مسکرا کے پوچھنے لگا۔ تالیہ ذرا سا مسکرائی۔

”ہر قسم کا آرٹ۔ چاہے وہ کیونس پہ بکھیرا جائے.... یا سٹیج پہ پر فارم کیا جائے یا کتاب میں کہانی کی صورت لکھا جائے۔ آرٹ حیران کرنے کا نام ہے۔ لوگ آرٹ دیکھنے پتہ ہے کیوں آتے ہیں انچے اشعر؟ تاکہ وہ حیران ہوں۔ amazed ہوں۔ دھوکہ کھا جائیں اور جب ان پہ دھوکہ کھلے تو وہ ششدر رہ جائیں۔ لوگ عام زندگیوں میں ہر چیز پہلے سے جان لینا چاہتے ہیں تاکہ دھوکہ نہ کھائیں، مگر آرٹ پہ وہ صرف حیران ہونے اور اپنا دماغ بھک سے اڑا دینے کے لئے پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ عجیب بات ہے نا؟“

”تو آپ کو لوگوں کو حیران کرنا اچھا لگتا ہے؟“ وہ محظوظ ہوا۔

”جی۔ مجھے وہاں سے آنا اچھا لگتا ہے جہاں سے انہوں نے توقع بھی نہیں کی ہوتی۔“ اس کی مسکراتی چمک دار آنکھیں اشعر پہ جی تھیں۔ ”آپ کو کیا اچھا لگتا ہے؟“

اشعر کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ ”میں ایک آرکیٹیکٹ ہوں۔ مجھے اونچی عمارتیں بنانا اور بلند یوں پہ کھڑے ہو کے دنیا کو دیکھنا اچھا لگتا ہے۔“ تالیہ نے دیکھا اس کے عقب میں شیشے کی دیوار سے دور تک پھیلی اونچی عمارتیں نظر آرہی تھیں۔

دروازہ دستک کے ساتھ کھلا اور رملی نے اندر جھانکا۔ ”سر... سوری مگر ضروری بات ہے۔“ ادھر داتن کان میں بولی۔ ”رملی ابھی اٹھ کے گیا ہے۔ عثمان نے اسے بتا دیا ہے شاید کہ فائل مل گئی ہے۔“

اشعر اس مداخلت پہ بد مزہ ہوا ابھی خفگی سے رملی کوٹو کئے والا تھا کہ تالیہ بیگ اٹھائے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”آپ کام کیجیے۔ میں چلتی ہوں۔“ انداز سنجیدہ اور لیا دیا سا تھا۔ اشعر نے گہری سانس لی، مسکرایا اور کھڑا ہو گیا۔ ”اوکے۔ نیلامی پہ ملاقات ہوگی، چپے تالیہ۔“ ”سی یو۔“ باہر آ کر وہ سیل فون پہ بٹن دباتی چلتی آئی جیسے کوئی ضروری میل کر رہی ہو۔ اشعر کے آفس کے سامنے لاؤنج سا بنا تھا۔ وہ ٹائپ کرتے کرتے وہیں بیٹھ گئی۔

”میں تیار ہوں۔ جیسے ہی رملی نکلے گا میں اس کا پیچھا کروں گی۔“ داتن کی آواز کان میں گونجی تو تالیہ جھکے سر کے ساتھ بولی۔ ”اسے جلد ہی پریشان ہو کے نکلنا چاہیے۔“

ایک منٹ گزرا۔ دو منٹ۔ پانچ منٹ۔ بالآخر رملی باہر آیا اور سیدھا اپنے کیبن کی طرف بڑھ گیا جو سامنے ہی تھا۔ کرسی سنبھالی اور کام کرنے لگا۔ تالیہ غیر آرام دہ ہوئی۔ چند منٹ مزید گزرے۔ نہ اشعر آفس سے نکلا، نہ رملی اپنی جگہ سے اٹھا۔ داتن بھی گڑبڑا گئی۔ اس کے کان میں بولی۔

”تالیہ.... یہ لوگ فائل چیک کرنے باہر کیوں نہیں نکلے؟ کسی بینک کی طرف یا گھر کی طرف؟ کہیں تو رکھی ہوگی انہوں نے فائل۔“

تالیہ نے آنکھیں اٹھائیں۔ ہرن جیسی آنکھیں جو اطراف کا ایکس رے کر لیتی تھیں۔ پتلیاں سکوڑ کے اس نے اشعر کے آفس کے بند دروازے کو دیکھا۔

”یا شاید وہ فائل چیک کر چکے ہیں۔“ اسے ساری سمجھ آرہی تھی۔ ”داتن.... فائل اس کے آفس میں ہی موجود ہے۔“ ”اوہ!“ داتن کی فکر مند آواز آئی۔ ”آفس میں واردات کرنے کے لئے ہفتے بھر کی تیاری چاہیے۔ کوئی لمبا con کھیلنا پڑے گا۔“

”ہمارے پاس ہفتہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس چند منٹ ہیں۔ مجھے وہ فائل ابھی چرانی ہے۔“

”مگرتالیہ....“

”ساری زندگی میں نے لالچ میں چوریاں کی ہیں داتن۔ ساری زندگی میں نے پیسے کے لئے جھوٹ بولے ہیں۔ میں چور ہوں، جھوٹی ہوں، مگر مجھے پہلی دفعہ کسی سے وعدہ نبھانا ہے۔ تو انکو کے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے ان کو کل صبح سے پہلے فائل دینی ہے تو دینی ہے۔ سروس با تھر و مز میں آؤ ہمارے پاس پلاننگ کے لئے دس منٹ ہیں۔“ وہ دبی آواز میں بولتی آگے بڑھ گئی۔ بجائے لفٹ کی طرف جانے کے وہ ایک دوسری راہداری میں مڑ گئی۔ داتن نے گہری سانس لی۔

”وہ ایک بے نیاز سیاستدان ہے جو پرسوں تک تمہیں یاد بھی نہیں رکھے گا۔ شکریہ کہہ کے آگے بڑھ جائے گا۔ طاقتور سیاستدانوں سے محبت کرنے والی لڑکیاں ہمیشہ پچھتاتی ہیں تالیہ۔“ افسوس سے داتن بولی تھی مگرتالیہ کچھ نہیں سن رہی تھی۔ اس کا ذہن نیا پلان سوچ رہا تھا۔

لابی کی گھڑی کی سوئیاں ٹک ٹک کرتی آگے بڑھ رہی تھیں۔

☆☆=====☆☆

اسٹوڈیو میں کیمرے آن تھے۔ تیز روشنیاں جل رہی تھیں۔ تین اطراف میں سبز رنگ کے کارڈ بورڈ کی دیواریں بنائی گئی تھیں۔ انٹرویو ریکارڈ ہوتے وقت سبز کارڈ بورڈ لگایا جاتا تھا اور بعد میں جب ٹی وی پہ دکھایا جاتا تو سبز رنگ پہ مختلف مناظر ایڈٹ کر دیے جاتے۔

اینکر سنجیدگی سے بیٹھا فاتح کو دیکھ کے سوال پوچھ رہا تھا....

”جب آپ وژن کی بات کرتے ہیں تو آپ کے ذہن میں بیس سال بعد کا ملائیشیا کیسا آتا ہے؟“

وان فاتح پر اعتماد سا بیٹھا تھا۔ اس سوال پہ ہلکا سا مسکرایا اور گویا ہوا۔ ”ملا کہ سلطنت جیسا۔ تمہیں معلوم ہے جیفری، بلکہ میں ملائیشیا کے لوگوں سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا ان کو معلوم ہے کہ چھ سو سال پہلے کا ملا کہ کیسا تھا؟“.....

اشعر کے آفس فلور کے سروس با تھر و مز میں وہ دونوں کھڑی تھیں۔ تالیہ نے بیگ سنک کے سامنے انڈیل رکھا تھا اور اندر سے کچھ چیزیں نکالتے ہوئے داتن سے کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ سر ہلا کے جواب میں اس کی تائید کر رہی تھی.....

”جیفری، چھ سو سال پہلے ملا کہ میں مسلمان سلاطین کی حکومت تھی۔ وہ سلطنت خطے میں ایک مضبوط اور طاقتور حیثیت رکھتی تھی۔

اس دور کے لوگ ہمارے جیسے نہیں تھے۔ کہتے ہیں وہ عظیم لوگ تھے مگر آج میرے ملک کے لوگوں کو ان سے زیادہ بہادر بننے کی

ضرورت ہے۔“.....

داتن با تھر و م کے کونے میں رکھی ڈسٹ بن میں اخبار پھاڑ پھاڑ کے ڈال رہی تھی۔ جب ڈسٹ بن بھر گئی تو اس نے لائٹ سے

کاغذ کو سلگایا۔ جلد ہی اخبار نے آگ پکڑ لی۔ شعلے بلند ہونے لگے.....

”آج میرے ملک کے لوگ عجیب منفی رویوں میں ڈوبے ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ تکلیف ان کے مظلوم پن سے ہوتی ہے

۔ یہ کس نے ہم انسانوں کو ہر وقت مظلومیت کی چادر اوڑھے رکھنا اور ہمدردی تلاش کرنا سکھایا ہے.....؟“

باتھ روم ایریا میں داتن ڈسٹ بن کو آگ لگاتی دکھائی دے رہی تھی اور تالیہ اپنا لباس بیگ میں اڑس رہی تھی۔ اس وقت اس نے سیاہ ٹائٹس شرٹ اور سیاہ ٹوپی پہن رکھی تھی۔ چست اور تیار۔ تیز تیز چلتے ہاتھ بیگ کی زپ بند کر رہے تھے۔ پھر بیگ کندھے پہ ڈالا اور کونے والے لٹو انلٹ میں گھسی جس کے اوپر روشن دان کی جالی لگی تھی۔ وہ اوپر چڑھی اور وینٹ کا ڈھکن اتارا.....

”آپ صرف سوشل میڈیا کو ہی دیکھ لیں، جیفری۔ مجھے اکثر لوگ وہاں اپنے دکھوں کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں۔ انسان کے پاس اگر تین چیزیں ہوں رزق، عزت اور صحت اور وہ پھر بھی وہ غمزہ ہو اور ہمدردی طلب کرتا نظر آ رہا ہو تو وہ ناشکرا ہوتا ہے.....“

تالیہ نے روشن دان کی جالی اتار کے نیچے پھینکی اور بلی کی طرح اندر گھس گئی۔ اندر لمبی سرنگ سی تھی۔ یہ وینٹ تھے اور ہوا کے لئے ساری عمارت میں پھیلے تھے۔ اتنے چوڑے کہ وہ اس میں سینے کے بل لیٹ کے رینگ رینگ کے آگے بڑھ سکتی تھی....

نیچے داتن ابھی تک آگ لگاتی دکھائی دے رہی تھی...

”میں جس ملک کا خواب دیکھتا ہوں وہاں مجھے لوگوں کو یہ سکھانا ہے کہ مظلومیت اور کمزوری کو خود پہ طاری کرنا چھوڑ دیں۔ نکل آئیں اس مائنڈ سیٹ سے کہ دنیا نے ہم پہ ظلم ڈھادیا۔ خاندان والوں نے ہمارے ساتھ برا کر دیا۔ دوستوں نے یوں دھوکہ دیا۔ ہم دکھی، ہم اداس۔ ہر وقت دوسروں سے ہمدردی مانگنا۔ یہ منفی رویے ہیں۔ ہمیں ان سے نکلنا ہوگا۔ مجھے بالکل ایسے لوگ اٹریکٹ نہیں کرتے جو چاہتے ہیں کہ لوگ ہر وقت ان کے غموں کی داستان سنتے رہیں۔“

داتن نے باتھ روم کا دروازہ کھولا تو دھواں باہر کو نکلا۔ وہ آگے آئی اور رہداری میں لگا فائر الارم کھینچ دیا۔ ساری عمارت الارم سے گونج اٹھی۔ موٹی عورت تیز تیز آگے چلتی گئی۔ ہرڈسٹ بن کے ساتھ رکتی... لائٹر سے آگ جلاتی اور آگے بڑھ جاتی... سی سی ٹی وی وہ پہلے ہی جام کر چکی تھی...

”انسان بہت عظیم مخلوق ہے۔ اس میں بہت طاقت ہے۔ اسے تو ساری دنیا کو سنبھالنا ہے اور وہ اپنے آپ کو ہی نہیں سنبھال پائے“ کتنے دکھ کی بات ہے! ہمیں اگر زندگی میں ”خوشی اور کامیابی“ حاصل کرنی ہے تو ہمیں ایک مثبت رویہ اپنانا ہوگا۔“

”اور مثبت رویہ کیسے اپنایا جاتا ہے آپ کی نظر میں؟“

وینٹ کے اندر ہیرمرنگ میں وہ کہنیاں گھسیٹ گھسیٹ کے آگے بڑھ رہی تھی۔ کندھے پہ چھوٹا بیگ بھی لا درکھتا تھا جس میں ضروری سامان تھا۔ ہر تھوڑی دیر بعد راستے میں کوئی جالی آتی اور وہ اس سے جھانکتی۔ نیچے آفمز کے کمرے نظر آتے جہاں ہڑبونگ

جچی تھی۔ لوگ فائر الارم سن کے چیزیں سمیٹ رہے تھے باہر بھاگ رہے تھے.....

”مثبت رویہ ماضی کے دکھوں اور پچھتاؤں سے نکلنے کا نام ہے۔ اگر آپ سے کچھ غلط سرزد ہوا ہے ماضی میں اور سب سے ہی ہوتا ہے تو اس پہ معافی مانگ کے اس سے سبق سیکھیں اور اس پہ ہر وقت کڑھنا چھوڑ دیں۔ آپ انسان ہیں آپ سے ہر وقت سیدھا نہیں چلا جاسکتا۔ چند ایک بار اگر گر بھی گئے تھے آپ تو اس کو بھول جائیں اور آگے کا راستہ دیکھیں۔“

اشعر کے آفس کے عین اوپر وہ وینٹ میں ریگتے ریگتے پہنچ چکی تھی۔ اب اس کی کہنیوں تلے چوکور جالی تھی جس سے آفس نظر آ رہا تھا۔ اشعر چیزیں سمیٹا اٹھ رہا تھا۔ باہر سے اس کو سیکرٹری بلا رہی تھی۔ فائر الارم مسلسل چنگھاڑ رہا تھا.....

”اور اگر آپ کو ماضی میں بڑے بڑے غم ملے ہیں تو ان کے پچھتاوے سے نکل آئیں۔ غلط فیصلوں پہ دکھی ہونا چھوڑ دیں۔ زندگی میں کوئی بھی چیز برا تجربہ نہیں ہوتی اگر آپ اس سے سبق سیکھ لیں۔ یہ ہوتی ہے مثبت اپروچ۔ جو برا ہوا ہے آپ کے ساتھ یا جو برا آپ نے کیا ہے..... دونوں سے سیکھنے کے پہلو نکالیں سبق حاصل کریں اور ریلیکس ہو جائیں۔ پھر وہ تجربہ آپ کو غمگین نہیں کرے گا۔“

اشعر موبائل اور والٹ لئے باہر بھاگ گیا۔ دروازہ بند کر دیا۔ آفس تنہا رہ گیا۔ تالیہ نے وینٹ میں لیٹے لیٹے بیگ سے ایک آلہ نکالا اور بٹن دبایا۔ تھوڑی دیر لگی اور آفس کے دونوں سی سی ٹی وی کیمرے بجھ گئے۔ اس نے جالی اتاری اور نیچے کود گئی۔ عین اشعر کی میز پہ۔ چہرے کو وہ سیاہ ski mask سے ڈھانک چکی تھی.....

”میں چاہتا ہوں میرے ملک کے لوگ دوسروں کو ہر وقت الزام دینا اور مظلوم بننا چھوڑ دیں۔ یہود و نصاریٰ نے ہمارے ملک کی ترقی روک رکھی ہے کفار ہمارے خلاف سازشیں کر رہے ہیں ان بے کار باتوں سے نکل آئیں۔ اگر کوئی قوم ترقی نہیں کرتی تو یہ اس کا اپنا قصور ہوتا ہے۔ لوگ تو ہر قوم کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ تو پھر دوسری قوموں نے ترقی کیوں کر لی؟ یہ آئینہ دیکھنے کا وقت ہے۔ اپنی غلطیاں بحیثیت قوم مان لینے کا وقت ہے۔“

تالیہ مراد اب اشعر کے آفس کی میز کا ایک ایک دراز کھول کے چیک کر رہی تھی۔ ہاتھوں پہ دستا نے چڑھا رکھے تھے۔ اللہ نے انسان میں بڑی طاقت رکھی ہے۔ کامیاب آدمی کون ہوتا ہے بھلا؟ وہ جو ماضی کے غم سے نکل آتا ہے اور مستقبل کے بڑے بڑے خواب دیکھتا ہے۔ ہمارے خواب اتنے بڑے اور انوکھے ہونے چاہئیں بحیثیت کیمرہ ہمیں ڈرائیں۔ پہلی دفعہ ان کو سوچ کے بھی خوف آئے۔ انسان صرف چھوٹے موٹے خوابوں کے لئے نہیں پیدا ہوا۔“

وہ اب دیواروں کی پینٹنگز ہٹا ہٹا کے دیکھ رہی تھی۔ 90 فیصد لوگ آفسز میں سیف کسی پینٹنگ کے پیچھے بناتے تھے۔ مگر پینٹنگز کے پیچھے کچھ بھی نہ تھا۔ سارے آفس میں کوئی سیف نہ تھا۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑی ہوئی اور آنکھیں بند کیں۔

اگر وہ اشعر محمود ہو تو وہ اس آفس میں سیف کہاں بنائے گی؟ سوچو تالیہ! انسان کی کمزوری وہ ہوتی ہے جس پہ وہ بھروسہ کرتا ہے۔ اشعر کس پہ بھروسہ کرتا ہے؟

”خوابوں کے لئے محنت کرنا پڑتی ہے۔ جان مارنی پڑتی ہے۔ لوگ مسئلوں کا آسان حل مانگتے ہیں، اور جب وہ نہ ملے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو victimhood بالکل نہیں پسند۔ ہمارے کچھ مسئلے ایسے ہوتے ہیں جن کو ٹھیک ہونے میں لمبا عرصہ لگنا ہوتا ہے تو منفی لوگوں کی طرح اس عرصے کو مظلوم بن کے اپنے دکھوں کی کہانیاں سنانے کے بجائے انسان کو آگے کے بارے میں اچھا سوچنا چاہیے۔ اسے اتنا مثبت بننا چاہیے کہ اس سے مثبت شعائیں پھوٹنے لگیں۔ وہ جہاں جائے، ان مثبت خوشگوار روشنیوں کو بکھیرتا جائے۔“

آفس کے وسط میں کھڑی تالیہ نے آنکھیں کھولیں اور اب کے آفس کو دیکھا تو اس کی نظریں مختلف تھیں۔ (میں ایک آرکیٹیکٹ ہوں۔ مجھے اونچی عمارتیں بنانا اور بلند یوں سے دنیا کو دیکھنا اچھا لگتا ہے۔) وہ وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ آرکیٹیکٹ بھی تھا۔ اس نے یہ آفس خود ڈیزائن کیا تھا۔

تالیہ نے دیکھا۔ دیوار پہ ایک بک شیلف نصب تھا۔ اس نے بتی بجھائی۔ بلاسٹڈز بند کیے۔ کمرہ اندھیر ہو گیا۔ پھر اس نے ننھی ٹارچ نکالی، جس میں نیلی روشنی سی تھی۔ اس نے وہ روشنی شیلف پہ پھینکی۔ اوپری قطار میں چوتھے نمبر پہ رکھی کتاب کے اوپر نیچے نشانات نظر آرہے تھے۔ (یہ ٹارچ اندھیرے میں وہ نشان بھی دکھا دیتی ہے جو روشنی میں نظر نہیں آتے۔) تالیہ نے مسکرا کے بتی جلائی اور اس کتاب کو ذرا سا باہر کھینچا۔ بک شیلف میں گڑبڑ اہٹ ہوئی اور وہ میکا کی انداز میں بائیں طرف کو سرکنے لگا.....

”میں زندگی میں کبھی کسی چیز کو لے کر پچھتا تا یا گلٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ جو غلطیاں کی ہیں زندگی میں، ان کا مجھے احساس ہے، مگر میں ہمیشہ حل ڈھونڈتا ہوں۔ بجائے خود کو لعنت ملامت کرنے کے، ہم ہر روز رات کو اگر یہ تسلیم کر لیں کہ ہم انسان ہیں، غلطیاں ہم سے ہو جاتی ہیں، کوئی بات نہیں، ہم اس سے سبق سیکھیں گے اور اگلے دن کو ایک نئے دن کے طور پہ گزاریں گے تو نیند اچھی آئے گی۔“

بک شیلف سامنے سے ہٹ چکا تھا اور پیچھے دیوار میں ایک سلور سیف نصب تھا۔ تالیہ نے کان میں لگا آلہ دبایا۔ ”داتن۔ یہ گلین ریڈر ہے۔ بیس منٹ لگیں گے مجھے۔ اشعر کے آفس اور راہداری کے درمیان مزید diversion کری ایٹ کرو۔ آگ‘ دھواں کچھ بھی۔“

”تالیہ... جلدی کرو... وقت کم ہے دیوانی لڑکی!“ داتن پریشانی سے کہہ رہی تھی.....

”اور جتنے میرے ساتھ زندگی میں حادثے ہوئے، میں ان کو بھی ایک تجربہ سمجھتا ہوں۔ میری بیٹی آریا نہ... سب جانتے ہیں کہ وہ

کھو گئی.... سب جانتے ہیں کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ میں چاہتا تو اس کا غم لے کر تارک الدنیا ہو جاتا.... خود کو پلیم کرتا.... دنیا بھر کو پلیم کرتا.... مگر میں نے اس کو ایک تجربے کے طور پر لیا۔ اللہ کی چیز تھی اللہ نے لے لی، لیکن کیا میں نے اس امانت کا شکر ادا کیا تھا؟ اور اب مجھے اپنے باقی دونوں بچوں کو کیسے پالنا ہے، ان کے لئے اللہ کا شکر گزار کیسے ہونا ہے، میں بس یہی سوچتا ہوں۔ مثبت رویہ وہ دیکھنے کا نام ہے جو آپ کے پاس بچ گیا ہے اور منفی رویہ ہر وقت اس کو سوچنے کا نام ہے جو کھو گیا ہے۔“

وہ کانوں میں ہیڈ فون لگائے سیف کے سامنے کھڑی مختلف سمتوں میں اس کا پیہر گھما رہی تھی۔ ماسک تلے چہرے پہ پسینہ آرہا تھا۔ وہ آوازیں سن رہی تھی۔ کس حرکت پہ کہاں کلک ہوتا تھا۔ سیف کا دھات دھیرے دھیرے اسے راز بتا رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ کاغذ پہ مختلف نمبرز لکھتی جا رہی تھی۔ جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔

”مجھے اپنے ملک کے لوگ مایوس اچھے نہیں لگتے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ مثبت بنیں۔ پر امید۔ اونچے خواب رکھنے والے۔ وسیع سوچ رکھنے والے۔ میں چاہتا ہوں لوگ شکر گزار بنیں۔ جو ہے اس کی قدر کریں۔ جو نہیں ہے اس کو زیادہ نہ سوچا کریں۔“ واضح کلک کی آواز آئی۔ تالیہ نے گہری سانس لے کر پیہر گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔

اندر سامنے سامنے نیل فولڈر والی فائل رکھی تھی۔ اس نے فولڈر نکالا، صفحے پلٹائے، تصدیق کی۔ پھر اپنے بیگ سے چند صفحے نکال کے فائل کے اندر لگائے، اور اصلی صفحات بیگ میں ڈال دیے۔

”تو میں وہی ترقی کرتی ہیں جو اونچے خواب دیکھتی ہیں اور یاد رکھنا جیفری۔ اگر آپ کو آپ کا خواب ڈراتا نہیں ہے، تو وہ بڑا خواب ہے ہی نہیں۔“

باتھ روم کے روشن دان سے وہ نیچے اتری۔ وہاں دھواں بھرا تھا، مگر دروازہ کھلا تھا۔ اس نے ماسک اتارا۔ بال کھولے۔ گلابی شرٹ سیاہ لباس کے اوپر پہنی۔ ہیٹ سر پہ لیا، جو تے تبدیل کیے اور تیزی سے باہر کود ڈی۔ دھوئیں کے باعث کھانسی آنے لگی تھی۔ فارالارم ہنوز رنج رہا تھا۔ فاربر گیڈ کا عملہ عمارت میں داخل ہو چکا تھا.....

”اگر ہم دنیا کو بدلنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنا رویہ بدلنا ہوگا، اور ہم دیکھیں گے کہ دنیا خود بخود بد بدلنے لگی ہے۔ یہ سوچ اور روشن کی تبدیلی ہے جو میں ایک بہتر ملائیشیا میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اسٹوڈیو میں بیٹھا شخص مسکرا کے کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے روشنی پھوٹ رہی تھی اور اینسکر سمیت سب محویت سے اسے سن رہے تھے۔

”تھینک یو وان فاتح آپ کے وقت کے لئے۔“ اینسکر نے کہہ کے کیمرے کی طرف رخ پھیرا۔ ”ناظرین، مجھے امید ہے کہ آپ نے بھی میری طرح بہت کچھ سیکھا ہوگا اور....“ انٹرویو ختم ہو چکا تھا۔

فاتح اب اپنی شرٹ پہ لگامایک اتار رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ سمٹ چکی تھی۔ ذہن میں حالم اور فائل کا خیال بار بار آرہا تھا۔

☆☆=====☆☆

کو الہ پور پہ رات اتر رہی تھی۔ اونچی عمارتیں بتیوں سے جگمگانے لگی تھی۔ ایسے میں تکون شیشون سے ڈھکی عمارت کے ایک فلور پہ جہاں باریسن نیشنل کا آفس تھا، وان فاتح لفٹ سے اتر رہا تھا۔ عثمان اور گارڈز ہمراہ تھے۔ آفس کیبن روشن تھے اور ورکرز کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

اس کو دیکھتے ہی بہت سی گردنیں مڑیں۔ لوگ کھڑے ہوئے۔ سلام دعا۔ وہ اتنے سالوں سے اس سلیبریٹی پروڈوکلر کا عادی تھا۔ سب کو مسکرا کے جواب دیتا آفس کی جانب آ گیا۔ ابھی دروازے کے قریب ہی تھا کہ جانے کس سمت سے ایک کیپ والا لڑکا نکل آیا۔ وہ پیروں میں پہیوں والے جوتے پہنے مرمریں فرش پہ گویا skate کرتا تیزی سے سامنے آیا تھا۔ (ایسے میسینجر لڑکے اکثر پہیوں والے جوتے پہنے راہداریوں میں زن سے گزرتے دکھائی دیتے تھے۔)

”وان فاتح۔ کوریئر۔“ ایک بیکج اس کی طرف بڑھایا اور ٹیبلٹ اسکرین آگے کی۔ فاتح ہلکا سا مسکرا دیا اور ٹیبلٹ اسکرین پہ انگوٹھا رکھ دیا۔ وہ جانتا تھا یہ کس کی طرف سے ہوگا۔

آفس میں آتے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور سیٹ پہ بیٹھتے ہوئے بیکج کھولا۔ اندر کاغذات رکھے تھے۔ ترتیب سے۔ وہ جیسے جیسے صفحات پلٹتا گیا، آنکھوں میں خوشگوار حیرت بھرتی گئی۔ اسی اثناء میں فون بجا تو وہ چونکا۔ پھر نمبر دیکھ کے مسکرایا۔

”تمہارا میجک شو کامیاب رہا، حالم۔“

”کیا آپ متاثر ہوئے؟“

”بہت زیادہ۔ مگر ہر میجک شو کے بعد حاضرین کرتب کاراز جانا چاہتے ہیں۔“

”مگر کیا آپ نے کسی جادوگر کو اسٹیج پہ کھڑے ہو کر اپنے راز بتاتے دیکھا ہے؟“

”بیک اسٹیج تو بتایا جاسکتا ہے نا!“

”آپ کیا جانا چاہتے ہیں؟“

”یہ تم نے کہاں سے لئے؟“

”اشعر محمود کے آفس کے سیف سے۔ میں نے چند ردی کاغذ فائل کے اندر رکھ دیے ہیں، تاکہ ان کو فوراً شک نہ پڑے۔ اب

آپ ان کاغذات کی حفاظت کیجیے گا۔“

”تم نے مجھے عثمان کے سامنے یہ سب کہنے کا کہا، تمہارے خیال میں وہ اشعر کے لئے کام کرتا ہے۔“

”آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ اشعر کے لئے کام کرتا ہے، اگر میں اتنے کم عرصے میں جان گیا ہوں تو آپ کیوں نہیں

جانتے ہوں گے بھلا؟“ عالم لمحے بھر کو بھی نہیں چوک رہا تھا۔ ترنت جوابات دے رہا تھا۔

فاتح ہلکا سا ہنس دیا۔ ”یہاں کوئی کسی کا وفا دار نہیں ہوتا“ ہمیں صرف کام نکلوانا ہوتا ہے۔ کسی اور کو رکھوں تو وہ بھی پک جائے گا۔“

”وفا داری آج بھی اپنا وجود رکھتی ہے و ان فاتح۔ کچھ لوگ وفا داری کے ایسے وعدے کر لیتے ہیں کہ اس کے لئے آگ میں بھی کود پڑتے ہیں۔ خیر...“ عالم نے گہری سانس لی۔ ”آپ کا کام ہو گیا۔ مجھے اجازت؟“

”اور تمہاری فیس؟“

”میں نے یہ فیس کے لئے نہیں کیا۔ سیاستدانوں سے کون پاگل پیسے لے گا؟ سیاستدانوں سے تو فیورز مانگے جاتے ہیں۔ آپ اب میرے مقروض ہیں۔ کبھی کوئی کام لے کر آؤں تو کر دیجیے گا۔ وہی میری فیس ہوگی۔“

فاتح نے ٹیک لگالی اور فون کان سے لگائے مسکرا کے اس کو سننے لگا۔

”کبھی مجھ سے ملنے آؤ، عالم۔“

”میں آپ کی توقعات کے برعکس ہوں، سر۔ ایسی خواہش نہ کریں تو اچھا ہوگا۔“ اس کی آواز میں اداسی گھل گئی۔

”ہوں... ویسے عالم کا کیا مطلب ہوا؟“

”خواب دیکھنے والا۔“

فاتح کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ وہ محظوظ ہو رہا تھا۔ ”یعنی کہ visionary!“ پھر جیسے یاد آیا۔ ”تم نے بتایا نہیں یہ کام کس کا تھا؟“

چند لمحے کو خاموشی چھا گئی۔ ”آپ چور کا نام جاننا چاہتے ہیں؟“ عالم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”اور میں یہ جانے بغیر فون نہیں رکھوں گا۔ میری ہٹ دھرمی سے سارا ملائیشیا واقف ہے۔“

”تو پھر سنیے۔ آپ کے گھر چوری.... (وقفہ دیا).... تالیہ مراد نامی لڑکی نے کی تھی۔ وہ کوئی سوشلائٹ ہے اور جس کا آپ کے گھر کچھ دنوں سے آنا جانا ہے۔“

فاتح نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ مراثبات میں بلایا۔ ”یعنی میرا شک درست تھا۔ گڈ جاب، عالم۔“

”میں آپ کے لئے حاضر ہوں، و ان فاتح۔ جہاں آپ کہیں، جب آپ کہیں۔“ اور کلک کے ساتھ فون بند ہو گیا۔ فاتح نے

خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ فون پرے ڈالا اور صفحات اٹھا کے پھر سے دیکھنے لگا۔ سارے دن کی کلفت دور ہو گئی تھی۔

تکون عمارت کے باہر... اندھیر پارکنگ میں وہ دونوں موجود تھیں۔ تالیہ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھی فون کان سے ہٹا رہی تھی

اور داتن ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے دھچکا لگا تھا۔

”یہ بکواس کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ تالیہ مراد چور ہے؟ تم ایسا کیسے کر سکتی ہو اپنے ساتھ؟“

”تو کیا کہتی؟“ وہ اداسی سے داتن کو دیکھ کے بولی۔ ”آپ کی بیوی چور ہے؟“

”ہمارے پاس ویڈیو ہے عصرہ کی۔“

”داتن وہ کسی پہ بھی اعتبار نہیں کرتے۔ ان کا کوئی دوست نہیں۔ وہ کسی سے جلدی متاثر نہیں ہوتے۔ مگر انہوں نے عالم کو تھینکس

تک نہیں کہا کیونکہ وہ صرف اجنبیوں کو شکر یہ کہتے ہیں۔ وہ عالم کو اجنبی نہیں سمجھتے۔ عالم نے ان کا اعتماد جیتا ہے۔ مجھے ان کو وہی بتانا تھا جو وہ سننا چاہتے تھے۔“

”مگر تم نے اپنا میچ ہی کیوں خراب کیا؟“ داتن صدمے میں تھی۔

”میں نے ان سے سچ بولا ہے۔ تالیہ نے ان کے گھر چوری کی تھی۔ بریسلٹ چرایا تھا نا۔ میں نے پہلی دفعہ کسی سے اتنا بڑا سچ

بولا ہے۔ اور میرا میچ تو ان پہ پہلے ہی خراب ہے۔“ وہ تلخی سے کہہ کے کاراسٹارٹ کرنے لگی۔ داتن ابھی تک صدمے سے چوراس کو دیکھ رہی تھی۔

”تم نے آج اپنی جان خطرے میں ڈالی تم نے آج اندھا دھند کھائی میں چھلانگ لگائی میں نے تمہیں کبھی ایسا نہیں کرتے دیکھا

تالیہ۔ ایسے مت کرو اس کے لئے۔ تمہارا دل بیمار پڑ گیا تو جسم کسی کام کا نہیں رہے گا۔“

”مجھے لگتا ہے میرا دل پہلے ہی بیمار پڑ چکا ہے لیا نہ صابری۔“ وہ بولی نہیں بس دل میں کہا اور اسٹیرنگ وہیل گھما دیا۔

کار آگے بڑھ گئی اور تکیوں عمارت پیچھے رات میں کھڑی رہ گئی۔

☆☆=====☆☆

وان فاتح کی رہائش گاہ کی بتیاں جگمگا رہی تھیں۔ رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ ایسے میں فاتح کے کمرے میں آؤ تو وہ

ڈریننگ روم میں کھڑا دکھائی دیتا تھا۔ وارڈروب کے دونوں پٹ کھلے تھے اور وہ بیگر سے کپڑے اتار رہا تھا۔ دو جوڑے لئے اور

کمرے میں واپس آیا جہاں بیڈ پہ ایک چھوٹا سفری بیگ کھلا پڑا تھا۔ پھر ایک دم ٹھنکا۔

عصرہ سامنے کرسی پہ آ بیٹھی تھی۔ خاموش۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے۔ اسے دیکھ کے جبراً مسکرائی۔

”کہاں جا رہے ہو؟“

وہ آگے آیا اور بیگ میں کپڑے تہہ کر کے رکھنے لگا۔ ”ملا کہ۔ کل چھٹی ہے نا۔“

”کیوں جا رہے ہو؟“ اس کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑیں۔

”سن باؤ (تین خزانوں) کے گھر کو بیچنے سے پہلے ایک آخری دن اس میں گزارنا چاہتا ہوں۔“

”ابھی کیسے پچو گے؟ کاغذات تو ہیں ہی نہیں۔“

”کاغذات مل گئے ہیں۔“ وہ سر جھکائے بیگ میں سامان اڑس رہا تھا۔ عصرہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”کیا مطلب؟ کہاں سے ملے؟“ تیزی سے بولی۔

”مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی۔ میں نے اور بجنل ڈاکومنٹس کہیں اور رکھے تھے۔ یہاں صرف کلرڈ کاپیز تھیں۔“ اس کی نگاہیں جھکی

تھیں اور وہ شیو کا سامان ایک خانے میں ڈال رہا تھا۔

”واٹ؟“ وہ شل رہ گئی۔ ”تو جو کاغذات یہاں تھے.... جو تالیہ نے چرائے تمہارے بقول وہ صرف فوٹوکاپی تھی؟“

”ہوں!“ اب ڈائریسٹر کی طرف بڑھ گیا۔ جھک کے دراز کھولا اور جرائیں نکالیں۔ وہ بالکل بے نیاز لگ رہا تھا۔

عصرہ چند لمحے اسے دیکھ گئی۔ پھر اس نے لب بھنج لئے۔ بازو سینے پہ لپیٹ لئے۔ ”تو صبح سے اتنا ہنگامہ کیوں مچایا ہوا تھا؟“

”کیونکہ وہ کاغذات اہم تھے۔“ وہ جرائیں لے کر واپس آیا اور ان کو بیگ میں ڈالا۔ ابھی تک عصرہ کو نہیں دیکھ رہا تھا۔

”اور میری نیلامی؟ میرے ڈونرز؟ وہ اہم نہیں تھے؟“ عصرہ کے اندر ابال سا اٹھنے لگا تھا۔ بے بسی.... غصہ.... فرسٹریشن.... وہ

شدید کیفیات کا شکار تھی۔

”تم نے میری اس ڈونر کو بے عزت کیا جو کانگ ہو جیسے لوگوں کو مدعو کر رہی تھی، جس نے میرا پورٹریٹ بنایا، جو گھائل غزال

خریدنے جا رہی ہے۔ میں پہلے دن سے تمہاری منت کر رہی ہوں کہ اس کے ساتھ سلوک اچھا رکھو، مجھے اس جیسے لوگوں کی ضرورت

ہے مگر تم....!“

فاتح نے اکتا کے چہرہ اٹھایا۔ ”اس نے چوری تو بہر حال کی ہے کاپیز ہی سہی۔“

”بس وان فاتح!“ عصرہ نے ہاتھ اٹھا کے سرخ چہرے کے ساتھ اسے روکا اور کھڑی ہوئی۔ ”کبھی وہ چور ہے تو کبھی میرا بھائی۔“

اور کبھی کہتے ہو فائل کھوئی ہی نہیں۔ وہ آج میرے آفس آئی تھی اور وہ شدید دکھی تھی۔“ فاتح کے ابرو اکٹھے ہوئے۔

”اس نے بدتمیزی کی تمہارے ساتھ؟“

”یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے کہ اس نے کیا کیا۔ میں تمہارے ایک ایک معاملے میں تمہارا ساتھ دوں اور تم میرے کام کو خراب کرو۔“

بس بہت ہو گیا۔ ایکشن لڑنا ہے لڑو۔ ملاک والا گھر بیچنا ہے پچو۔ لیکن میرے دوستوں سے اب تم دور رہو گے۔ اتنے سالوں سے

تمہارے جنون کے پیچھے ہم خوار ہو رہے ہیں۔ اب اور نہیں۔“

”تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ کاغذات مل گئے ہیں نہ کہ غصہ کرنا چاہیے۔“ وہ غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ عصرہ کی آنکھیں سرخ

انگرا رہی تھیں۔

”کس بات پہ خوش ہوں؟ میرے بھائی پہ الزام لگایا تم نے؟ میری ڈونز کو بے عزت کیا تم نے؟ اس فائل کے پیچھے جو کھوئی بھی نہیں تھی۔ ایک بات میری سن لو فاتح۔ اگر آئندہ تم نے میرے دوستوں کے ساتھ یہ کیا تو....“ وہ انگلی اٹھا کے کہہ رہی تھی کہ....

”ایک بات میری بھی سن لو عصرہ... اگر مجھے کبھی پتہ چلا کہ تم نے اس کام میں اپنے بھائی یا اس لڑکی کی مدد کی ہے تو یاد رکھنا اس کے بعد ہم اس موڑ پہ آجائیں گے جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوگی۔“ وہ ٹھنڈے انداز میں بولا ایسے کہ نگاہیں اس کے اندر تک جھانک رہی تھیں۔ عصرہ نے انگلی گرا دی۔ مگر وہ ٹھنڈی نہیں پڑی تھی۔ غصے سے پیر پٹختی مڑی اور باہر نکل گئی۔

اسے پسینہ آرہا تھا۔ جسم تپ رہا تھا۔ تیزی سے وہ کمرے میں واپس آئی۔ دروازہ بند کیا۔ پھر ڈرینگ روم میں آئی۔ یہاں کا بھی دروازہ مقفل کیا اور کپکپاتے ہاتھوں سے کال ملائی۔

”ایش.... فاتح کہہ رہا ہے اسے فائل مل گئی ہے۔“ پیشانی چھوتی وہ دبی آواز میں بولی تو شدید پریشان لگ رہی تھی۔

”ہاں کا کا.... آنگ نے یہی بات آگے پیچھے بھی دوسرے لوگوں کے سامنے بھی دہرائی ہے کہ اس کو کسی انویسٹی گیٹر نے فائل واپس لا دی ہے مگر ڈونٹ وری... فائل میرے پاس ہی ہے۔“ اس کی مطمئن آواز سنائی دی تھی۔

”نہیں۔ میں فاتح کو جانتی ہوں۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اصل فائل کھوئی ہی نہیں تھی۔ He is a terrible liar۔ وہ جھوٹ بول رہا ہے مگر اس کی شکل پہ لکھا ہے کہ اس کو واقعی فائل مل گئی ہے۔“

”ریلیکس کا کا۔ میں نے خود چیک کیا ہے وہ میرے پاس ہی ہے۔“

”میں کیا کہہ رہی ہوں“ اشعر وہ فائل تمہارے نہیں فاتح کے پاس ہے۔ وہ اسے تم سے نکلوا چکا ہے۔ شاید کسی انویسٹی گیٹر کے ذریعے۔ وہ وان فاتح ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اور اسے مجھ پہ بھی شک ہو رہا ہے۔“

”کا کا۔ ہم صبح بات کریں گے۔ میرے آفس میں پہلے ہی حالات خراب چل رہے ہیں۔ میں سارے دن کا تھکا آیا ہوں۔“ وہ بے زار ہوا تو عصرہ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

”میں نے تمہارے لئے اتنا بڑا خطرہ مول لیا اور تمہیں پرواہ ہی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے۔ اب تم ایکشن لڑو یا فاتح مجھے پرواہ نہیں ہو گی۔ میں صرف اپنا فائدہ نقصان دیکھوں گی جیسے تم لوگ دیکھتے ہو۔“ کہہ کے ٹھک سے فون بند کیا۔ اشعر شاید وضاحت دے رہا تھا مگر اس نے نہیں سنا۔

پھر وہ گھومی تو ڈریسر مرر سامنے آیا۔ وہ خاموش ڈرینگ روم میں تنہا کھڑی تھی۔ قدم قدم چلتی آئینے کے قریب آئی اور اپنا عکس دیکھا۔ انگلی کے پوروں سے آنکھوں کے کنارے کو چھوا۔

”آریانہ کے نقش بھی مجھ میں ملتے تھے۔ ٹین اتج میں پہنچ کے وہ بھی ایسی ہی لگنے لگے گی۔ آج کے دن وہ کھوئی تھی۔ چھ سال

پہلے۔ تیرہ سال کی ہو گئی ہوگی وہ۔“ چند لمحے وہ خود کو دیکھتی رہی، پھر مسکرائی، جیسے چہرے کو ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔ کریم اٹھائی اور نرمی سے چہرے پہ لگانے لگی۔ جلد چمکنے لگی تو وہ دل سے مسکرائی اور فون اٹھالیا۔
اب وہ واپس کمرے میں آتے ہوئے آرام دہ انداز میں بات کر رہی تھی۔
”کیسی ہوتا لیہ؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں، مسز عصرہ؟“ تالیہ کی سنجیدہ مگر نرم آواز سنائی دی۔ عصرہ بڑی کرسی پہ بیٹھ گئی اور ٹانگ پہ ٹانگ جما لی، پھر بھورے بالوں کی ایک لٹ انگلی پہ لپیٹتے ہوئے گویا ہوئی۔
”میں فاتح کی طرف سے معذرت کرنا چاہتی تھی۔ وہ آج کل الیکشن کی وجہ سے ٹینس ہے۔ جلد خفا ہو جاتا ہے۔ جانے تمہیں کیا کیا کہہ بیٹھا۔“

”کوئی بات نہیں۔ ان کو تو قوم دو چار قتل بھی معاف کر دے گی۔“ تالیہ کی اداس ہنسی گونجی۔
”مگر میں مداوا کرنا چاہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ ایسی کوئی بھی بات ہمارے درمیان آئے۔“ عصرہ کی بادامی آنکھیں جیسے تانے بانے بنتی دکھائی دے رہی تھیں۔

”مداوا مت کہیں.... درخواست سمجھ لیں۔ ایک چھوٹا سا کام آپ میرے لئے کر سکتی ہیں۔“
”شیور۔ بتاؤ۔ مجھے خوشی ہوگی۔“ اور پھر تالیہ کی بات سن کے اس کی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی۔
”بالکل تالیہ۔ یہ میں کر سکتی ہوں۔ اور کل ہی کر سکتی ہوں۔“
کھڑکی سے باہر جس آلود رات دھیرے دھیرے گہری ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

حالم کا اونچا بنگلہ رات کے اس پہر خاموش پڑا تھا۔ تالیہ داتن کو ڈراپ کر کے کار اندر لائی تو پورچ کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ وہ کار سے نکلی اور سوئچ بورڈ کی طرف آئی۔ مگر ٹھک کے رک گئی۔ سانس بھی روک لیا۔ پھر ایک دم گھومی۔
وہ پورچ کے ستون کے ساتھ کھڑا تھا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے، مسکراتا ہوا۔ سہج۔
تالیہ کا دل بری طرح دھڑکا۔ ایک نظر گیٹ کو دیکھا جو چارنٹ کا جنگلہ نما تھا۔ کوئی بچہ بھی اس کو پھلانگ لے۔ مگر پھر بھی یہ سہج کی طرف سے ایک جرات مند انداز تھا۔ وہ اس کے گھر کے گیٹ کے اندر تک پہنچ چکا تھا۔
”کیوں آئے ہو؟“ بھنویں اکٹھی کر کے وہ غصے سے بولی۔ سہج نے ایک ہاتھ جیب سے نکالا اور چھوٹی سی کچھڑی داڑھی کھجائی۔

”تم سے ملاقات کا دل چاہ رہا تھا۔ سارا دن تو تم بڑے لوگوں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہو۔ رات کو ہی فارغ ہو کے گھر آتی ہو۔“

”نکل جاؤ میرے گھر سے۔“ اس نے بازو لمبا کر کے غصے سے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ رنگت گلابی پڑنے لگی۔ ایئر پورٹ

... وہ بیگ ... وہ تکلیف ... سب ذہن میں تازہ ہو گیا۔ ایک اس آدمی سے اسے ڈر لگتا تھا۔ اس نے جیسے کبھی ساتھ چھوڑا ہی نہیں تھا۔

”یہ میرا اکاؤنٹ نمبر ہے۔“ اس نے ایک پرچی تالیہ کی طرف بڑھائی۔ تالیہ برہمی سے اسے گھورتی رہی۔ پرچی نہیں تھامی تو

سمجھنے سے اس کی کار کی چھت پہ چپکا دیا۔ وہ sticky نوٹ تھا۔ فوراً چپک گیا۔

”تمہارے پاس دو دن ہیں۔ کل اور پرسوں۔ پھر میں وہ کروں گا جو تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ ان دو دنوں

میں میرے وظیفے کی رقم کا تعین کر لو، میرا لائف ٹائم پلان تیار کرو اور اس اکاؤنٹ میں پہلی قسط بھجوا دو۔“ وہ چبا چبا کے کہہ رہا تھا

۔ ”اگر دو دن تک مجھے رقم نہ ملی تو تمہارا یہ تاش کے پتوں کا گھر (انگلی سے اونچے بنگلے کی طرف اشارہ کیا) نیچے آن گرے گا۔“

گھنٹی بجی تو دونوں نے چونک کے دیکھا۔ جنگلے نما گیٹ کے باہر نیم اندھیرے میں کھڑا ایڈم نظر آ رہا تھا۔ سمجھنے سے اس نے کالر کھڑکا کے

سیدھے کیے۔

”تمہارے مہمانوں کے سامنے تمہاری اصلیت کھولنے کا دل تو بہت چاہ رہا ہے مگر کیا کروں، مسلمان کی ایک زبان ہوتی ہے

۔ اور دو دن تک اس زبان کو میں بند رکھوں گا۔ صرف دو دن ہیں تمہارے پاس، ایڈم تالیہ۔“ مسکراتی نظر اس پہ ڈالی اور گیٹ کی

طرف چلا گیا۔ البتہ باہر نکلتے ہوئے اس نے سر سے پیر تک ایڈم کو دیکھا ضرور تھا۔

”آ جاؤ ایڈم!“ خفا کھڑی تالیہ نے وہیں سے پکارا۔ اس نے ابھی کچھ دیر پہلے ایڈم کے کیسیج کا جواب دے کر اسے گھر آنے کا

بولتا تھا۔

ایڈم ایک ناپسندیدہ نظر اس آدمی پہ ڈالتا اندر آیا۔ تالیہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ وہیں کار کے ساتھ اندھیر پوچ میں کھڑی رہی۔

بیگ کہنی پہ تھا اور بازو سینے پہ لپیٹ رکھے تھے۔

ایڈم ذرا فاصلے پہ رکا۔ سادہ پینٹ شرٹ میں ملبوس، ذرا دہنی رنگت والا ایڈم آنکھوں میں الجھنیں لئے ہوئے تھا۔

”بولو۔ کیوں آئے ہو؟“ وہ خفا اور اکتائی ہوئی لگتی تھی۔

”کیا یہ آدمی آپ کو تنگ کر رہا تھا؟“

”اس کی فکر مت کرو۔ میں پولیس آفیسر ہوں، ان لوگوں سے نبٹ سکتی ہوں۔“

”یہی جاننے آیا ہوں۔ آپ پولیس آفیسر ہیں واقعی یا نہیں؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے ٹھنڈے انداز میں بولا تو تالیہ کے

ماتھے پہ بل پڑے۔ اس نے ہتھیلی پھیلائی۔
”میرا سکہ؟“

”آپ نے تو کہا تھا وہ سرکار کا ہے۔“

”مگر وہ واپس میرے ذریعے ہی جائے گا۔“

”نہیں بچے تالیہ۔“ اس نے غور سے تالیہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں وہ آپ کو نہیں دے سکتا۔ مجھے آپ پہ اعتبار نہیں رہا۔“ تالیہ نے مٹھی نیچے گرا دی۔

”ایسا کیا کیا ہے میں نے جو تم مجھ پہ شک کر رہے ہو؟“

”آپ نے ابھی تک یقین دلانے کے لئے کچھ کیا ہی نہیں ہے۔“

”میں تمہیں ایک بونس آفر کر رہی تھی ایڈم۔“ وہ جھلا کے حیرت سے بولی۔

”آپ مجھے لالچ دے رہی تھیں۔ مگر میرا دل نہیں مانتا۔ مجھے لگتا ہے آپ شروع دن سے اس سکے کے پیچھے تھیں۔ میرا نہیں

خیال وان فاتح آپ سے واقف ہیں ورنہ وہ گھر میں ہونے والی چوری کے بارے میں آپ سے سوال جواب کیوں کرتے؟“

تالیہ لمحے بھر کو خاموش ہوئی۔ ”وہ سب عصرہ اور اشعر کو دکھانے کے لئے تھا تا کہ اصل چور مطمئن رہے کہ فاتح کو اس پہ شک نہیں اور ہم اس کو پکڑ لیں!“

”یہ سب کہانیاں ہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلارہا تھا۔ آنکھوں میں افسوس تھا۔ ”اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کی مدد کروں تو آپ کو

مجھ سے سچ بولنا ہوگا۔ سچ بولنے سے معاملہ ماضی کا حصہ بن جاتا ہے اور جھوٹ اسے مستقبل کا حصہ بنا دیتا ہے۔ آپ کون ہیں۔ آپ

کا مقصد کیا ہے اور میں آپ کی مدد کر کے درست کروں گا یا نہیں؟ مجھے صرف سچ بتائیں بچے تالیہ۔“

اندھیر پور راج میں کھڑی سنہرے بالوں والی لڑکی چند لمحے تندہی سے اسے دیکھتی رہی۔

”میرا نام تاشہ کمال ہے اور میں ایک پولیس آفیسر ہوں۔ اگر چاہتی تو پولیس بھیج کے وہ سکہ تم سے ری کور کر کے تمہیں چوری کے

انزام میں جیل بھیج سکتی تھی مگر مجھے تم پہ ترس آیا اور میں نے سوچا کہ تمہیں بونس ملنا چاہیے۔ بہر حال کل تک سوچ لو۔ کس طرح واپس

کرنا ہے تم نے وہ سکہ۔ یہ فیصلہ کر لو۔ اس کے بعد ہم دونوں ساتھ کام نہیں کریں گے۔“

”یعنی آپ مجھے پورا سچ نہیں بتائیں گی۔“ ایڈم زخمی لہجے میں بولا اور پھر شکوہ کننا نظروں سے اسے دیکھتا قدم قدم پیچھے ہٹا گیا۔

”اب میں سچائی کی تلاش خود کروں گا“ بچے تالیہ۔ ”وہ پیچھے ہٹ رہا تھا اور تالیہ خاموشی سے اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔

ایڈم چلا گیا اور وہ اسے روک بھی نہ سکی۔ آج کے لئے بہت سچ بول چکی وہ۔ اب مزید نہیں۔ اسے ایڈم کا کوئی اور حل سوچنا پڑے

گا۔

”وہ تمہارے خواب میں تمہارے ساتھ خزانہ دھونڈ رہا تھا۔ اس کو خزانے کا راز بتا دو، تالیہ!“ دل میں کسی نے کہا مگر اس نے سختی سے دل کو جھڑکا۔

’میں خزانہ کسی کے ساتھ شیئر نہیں کروں گی۔ میں ایڈم کو بیچ نہیں بتا سکتی۔ اسے لالچ آگیا اور اس نے سارا خزانہ خود حاصل کرنے کا سوچ لیا تو؟ اونہوں۔ خزانہ صرف میرا ہے۔ میرے باپا اور میرے گاؤں والوں کا ہے۔“

رات تاریک ہوتی گئی اور وہ اپنے کمرے میں بیڈ پہ آلتی پالتی کیے بیٹھی سوچتی رہی۔ ہاتھ میں سنہرا لاکٹ پکڑ رکھا تھا۔ بار بار خود کو جھڑکتی۔ اپنی ہی تردید کرتی۔ سکہ اس کا تھا۔ چابی اس کی تھی۔ وہ اس کو شیئر نہیں کرے گی۔

مگر کیا واقعی چابی اس کی تھی؟ اس نے سنہری لاکٹ کو دیکھا اور پھر اسے گردن میں پہنا۔ پیچھے ہگ بند کرتے وقت وہ تیار تھی۔ وہ اس کی یاد دوں کا پنجرہ تھا اور وہ اس میں کھو جانے کو تیار تھی....

منظر ایک دم بدلا.... آنکھوں کے سامنے روشنی چھانے لگی۔ آگ کی سی روشنی.... جیسے بھڑکتے شعلے ہوں۔ وہ مدھم ہوئے تو اس نے خود کو ایک چھوٹے سے کمرے میں پایا۔

مراد انگلیٹھی کے پاس بیٹھا ہے.... جھک کے وہ لوہے کے چمٹے سے دہکتی چابی انگاروں کے اوپر سے اٹھاتا ہے... وہ ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے، پنچوں کے بل اس کے پاس بیٹھی دلچسپی سے اس کی حرکات دیکھ رہی ہے....

چابی سنہری دہک رہی ہے... مراد اس کو احتیاط سے اٹھائے کھڑا ہوتا ہے پھر واپس ایک میز کی طرف آتا ہے... وہ بھی فوراً اٹھ کے پیچھے لپکتی ہے...

اب وہ دونوں میز کے مخالف سروں پہ کھڑے ہیں.... درمیان میں ایک پیالہ ہے جس میں پانی جیسا کوئی مائع ہے... مراد کو پسینے آ رہے ہیں وہ ایک ہاتھ سے پیشانی پونچھتا ہے اور دوسرے سے.... چمٹا پیالے کے اوپر لاتا ہے... پھر چابی اندر گراتا ہے... وہ ڈبکی کھاتی ہے اور ٹوٹ جاتی ہے....

تالیہ کے لب کھل جاتے ہیں... وہ ہراساں سی آنکھیں اٹھاتی ہے....

”باپا.... یہ تو ٹوٹ گئی....“

”اس کو ٹوٹنا ہی تھا، تالیہ.... پھر سے جڑنے کے لئے!“

”وہ کیسے؟“

”یہ چاند کی اکیسویں تک اس پانی میں پڑی رہے گی۔ پھر اس کو نکال کے جوڑا جائے گا۔ ابھی یہ اتنی گرم ہے کہ یہ میری روح

تک کھا جائے گی۔“ وہ میز پر دونوں ہاتھ رکھے مسکرا کے اسے بتا رہا ہے۔ وہ درمیانی عمر کا آدمی ہے۔ دبلا پتلا، مگر چہرہ بے حد پر کشش ہے۔ سیاہ بال کندھوں تک آتے ہیں۔ سر پر رو مال لپیٹ رکھا ہے۔ زبوں حالی، غربت، کمرے کی ہر شے سے ٹپکتی ہے۔

”اور اسے کون جوڑے گا، بابا؟“ ننھی لڑکی کھوئے کھوئے انداز میں پوچھتی ہے....

”جو اس کا مالک ہوگا۔ یعنی میں۔ جو بھی اس کو ٹوٹنے کے بعد جوڑتا ہے وہی چابی کا مالک ہوتا ہے۔ یہ خزانے کی کنجی ہے تالیہ۔ سوچو.... اگر ہم خزانے کا قفل کھول لیں تو اپنے لوگوں کے لئے کیا کچھ نہیں کر سکتے....“

”جب ہمارے پاس خزانہ آجائے گا تو کیا آپ کا خاندان ہیں قبول کر لے گا، بابا؟ کیا وہ لوگ....“

مگر مراد کی آنکھوں میں سرخی ابھرتی ہے۔

”میں ان کا ذکر بھی نہیں سنتا چاہتا، تالیہ۔ وہ ظالم لوگ ہیں۔ انہوں نے کیا کیا ظلم نہیں ڈھائے ہمارے گاؤں پر؟ اب چلو یہاں سے۔ اور سنو، تم اس کمرے میں میری اجازت کے بغیر نہیں آؤ گی۔“ وہ انگلی اٹھا کے تنبیہ کرتا ہے اور ننھی لڑکی جھٹ سر ہلا دیتی ہے....

بوجھ بڑھ گیا تھا.... یاد دیں بھاری ہو رہی تھیں.... تالیہ نے کراہ کے لاکٹ نوچ ڈالا....

کوئی فلم سی بند ہوئی۔ روشنی چھٹ گئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔

وہ اپنے بیڈروم میں بیٹھی تھی... تکیہ گود میں رکھے۔ سب کچھ کتنا مختلف تھا اس کمرے اور اس کمرے میں.... کچھ غلط تھا ادھر... کچھ عجیب سا.... کچھ ایسا جو اس کا دماغ پکڑ نہیں پارہا تھا....

کیا معلوم داتن درست کہہ رہی ہو اور....؟

اونہوں۔ اس نے جھرجھری لے کر سر جھٹکا۔ ایسا ناممکن ہے۔ کبھی نہیں۔ یہ موٹی بھی نا!

وہ چپ لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔

”کیا مطلب ہوا، حال کا؟“

”کبھی مجھ سے ملنے آؤ، حال!“

ذہن میں کسی کا محظوظ لہجہ گونجا تو وہ بند آنکھوں سے مسکرائی۔ ایک عجیب دن کا ودرے بہتر انجام ہوا تھا....

☆☆=====☆☆

اگلی صبح ابھی فجر قضا ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا جب وان فاتح کی رہائش گاہ پہ صبح کے ہنگامے جاگ اٹھے۔

آسمان ابھی گہرا نیلا تھا اور پورچ میں بتیاں جلی تھیں۔ ملازمہ کار میں اس کا بیگ رکھ رہی تھی اور وہ ساتھ کھڑا مو بائل پہ کچھ ٹائپ

کر رہا تھا۔ نیلی جینز کے اوپر سفید ڈریس شرٹ پہنے اس نے آستین کہنیوں تک موڑ رکھے تھے اور پاؤں میں جوگرز تھے۔ ہمیشہ کی طرح یگ اور فریش۔

پھر موبائل جیب میں ڈال کے ڈرائیور سے چابی مانگی۔ ”میں خود ڈرائیو کروں گا تم گھر جاؤ۔“
”مگر میر... سیکورٹی اساف؟“

”کیا میں ایک دن کی چھٹی پہ نہیں جاسکتا؟“ ذرا سا مسکرا کے پوچھا اور ڈرائیونگ ڈور کھولا۔ ڈرائیور فکر مند سا ہوا۔
”نہ دو گھنٹے کا سفر ہے... آپ مجھے ڈرائیو کرنے دیں۔“

فاس سے پہلے کہ فاتح کچھ کہتا اندر سے عصرہ آتی دکھائی دی۔ ساتھ ہی وہ دونوں بچوں کو باہر لا رہی تھی جو سوئے سوئے سے لگے رہے تھے مگر منہ دھلے اور بال بنے ہوئے تھے۔ فاتح نے اچنبھے سے ابرو اٹھائے۔
”یہ کیا؟“

عصرہ نے مسکرا کے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ ”سن باؤ کے گھر میں آخری دن ہم سب کو ساتھ گزارنا چاہیے۔“ پھر ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ ”تم پچھلی کار میں سیکورٹی گارڈز کے ہمراہ آؤ گے۔ جاؤ۔“ پھر اس نے فاتح کو دیکھا جو ذرا حیران ہوا تھا۔ ”تمہیں اعتراض ہے کیا؟“

فاتح کے چہرے پہ مسکراہٹ رنگ گئی۔ ”بالکل نہیں۔ اس سے اچھی بات کیا ہوگی کہ ہم سب ایک ساتھ جائیں۔“ وہ خوش ہوا تھا۔ ”مگر میں ساری فوج کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔“ ابرو سے سیکورٹی کی کار کی طرف اشارہ کیا۔

”وہ تمہارے لئے نہیں ہیں فاتح۔ وہ ہمارے بچوں کی حفاظت کے لئے ہیں۔ اور مجھے شاید جلدی واپس آنا پڑے دوپہر تک تو مجھے الگ کار چاہیے ہوگی۔“ وہ سارے فیصلے کر چکی تھی۔ سن گلاسز آنکھوں پہ چڑھائے فرنٹ سیٹ پہ استحقاق سے بیٹھی تھی۔

وان فاتح نے سمجھ کے سر ہلا دیا اور ہیلٹ پہنتے ہوئے گردن موڑی۔ پیچھے جولیانہ اور سکندر بیٹھے تھے۔ وہ مسکرایا۔

”آج میں تمہارے دادا کا گھر آخری دفعہ دیکھنے جا رہا ہوں۔ اور میں بہت خوش ہوں کہ تم لوگ میرے ساتھ ہو۔“

”ڈیڈ... ہم وہ گھر کیوں بیچ رہے ہیں۔“ سکندر اداس سا ہوا۔ گیارہ سالہ خوبصورت بچہ جوانی عمر سے زیادہ ذہین لگتا تھا۔

”ہم کون سا وہاں رہتے ہیں سکندر؟“ جولیانہ نے ناک چڑائی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری تھی۔

”کتنے دنوں بعد ڈیڈ نے تمہارے لئے وقت نکالا ہے کیا تم دونوں ان کو یونہی تنگ کرتے جاؤ گے؟“ عصرہ نے نرمی سے ٹوکا تو

سکندر نے سمجھداری سے سر ہلایا۔

”میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا۔ ڈیڈ جو بھی کریں گے صحیح کریں گے۔“

”ڈیڈ!“ جولیانہ نے ابرو اکٹھے کیے چہرہ واپس موڑا۔ ”اس گھر کو ”سن باؤ“ (تین خزانوں) والا گھر کیوں کہتے ہیں؟“
 فاتح نے چابی انکیشن میں گھمائی اور مسکرا کے اسٹیرنگ وہیل پھیرا۔ ”یہ ایک دلچسپ کہانی ہے اور تمہیں پتہ ہے تمہارے ڈیڈ کو
 تمہیں کہانیاں سنانا کتنا اچھا لگتا ہے ہوں؟“ وہ اب کار پیچھے موڑ رہا تھا۔
 صبح کی سفیدی دور افق پہ پھیل رہی تھی اور کوالا لمپور جاگنے لگا تھا۔
 یہ ایڈم کی نوکری کا گیارہواں اور آخری دن تھا جو ساری دنیا کے لیے اسی رات بارہ بجے ختم ہو جانا تھا مگر ان تین انسانوں کے
 لئے وہ کبھی نہ ختم ہونے والا دن بنے جا رہا تھا....

☆☆=====☆☆

صبح کی سفیدی اب سنہرے پن میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اشعر محمود کی آفس بلڈنگ کے ۳۵ فلورز مکمل طور پہ جاگ چکے تھے اور کام
 کے دہنی لوگ منہ اندھیرے ہی جا ب پہ پہنچ چکے تھے۔
 صبح اٹھنے والے... تازہ ذہن کے ساتھ کام کرنے والے.... اپنی زندگیوں کے ایک ایک منٹ کو استعمال کرنے والے
 لوگ.... کامیابیاں پھر ایسے ہی تو نہیں ملا کرتیں.... برکتیں ایسے ہی تو گھروں پہ نازل نہیں ہوتیں... رزق ایسے ہی تو نہیں بڑھ جاتا۔
 صبح اٹھنے والوں اور سورج نکلنے کے بعد اٹھنے والوں میں اتنا ہی فرق تھا جتنا کامیابی اور ناکامی میں۔
 اشعر محمود اپنے آفس میں کھڑا تھا۔ بک شیلف سامنے سے ہٹا تھا اور دیوار میں نصب سیف کھلا پڑا تھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑے
 بھنویں بھنچنے فائل کے صفحے پلٹا رہا تھا۔ جیسے جیسے اگلا صفحہ سامنے آتا اس کی رنگت تبدیل ہوتی گئی۔ آخر میں وہ مڑا اور پوری قوت سے
 فائل دیوار پہ دے ماری۔ صفحات ادھر ادھر بکھر گئے۔ خالی صفحات۔
 ایک طرف ہاتھ باندھے کھڑا ملی کھنکھارا۔ ”نمر... میں نے خود چیک کیا تھا۔ جب مسز عصرہ نے فائل دی تھی تو اس میں اصلی
 ڈاکومنٹس تھے۔“

”اب اس میں صرف بلینک پیپر ہیں۔ عثمان کی کال کے بعد میں نے صرف سیف کھول کے فائل کو دیکھا اور مطمئن ہو گیا کہ
 فائل پڑی ہے۔ اُف۔“
 ”کسی نے آگ کے دوران کل شاید کاغذات تبدیل کیے ہوں۔“

اشعر غصے سے اس کی طرف گھوما اور غرایا۔ ”سیف کی حالت دیکھو۔ ایک ضرب تک نہیں لگی اس پہ۔ کسی نے اسے کھولا تک
 نہیں۔ اندرز یورات ہیں، پیسے ہیں، ایک چیز بھی نہیں ملی۔ تم نے پیپر دیکھے ہی نہیں تھے شاید۔“ اس نے سر پکڑ لیا۔ ”میں نے بھی
 دیکھے بغیر اندر ڈال دیے۔ میں جلدی میں تھا۔ اُف۔“

”نمر... کل مس تالیہ بنت مراد بھی تو آئی تھیں۔“ رملی چونکا۔ اشعر نے گھور کے اسے دیکھا۔

”وہ سارا وقت میرے سامنے بیٹھی رہی تھی۔ اپنی غلطی اس کے سرمت ڈالو۔ یہ خالی دماغ کی سوشلائٹس کو ایوننگ ڈریسز اور فیشن سے فرصت نہیں ملتی جو اس طرح کا کچھ سوچیں۔ نان سینس۔“ بے زاری سے کہہ کے وہ اپنی سیٹ تک آیا۔ رملی چپ ہو گیا۔

”وان فاتح صرف ایک صورت میں سرینڈر کرے گا اگر اس کے پاس الیکشن لڑنے کے لئے پیسے نہ ہوں۔“ اشعر نے سیٹ کا رخ پیچھے شیشے کی دیوار کی جانب موڑ لیا جس کے پار اونچی اونچی عمارتیں اور نیچے سڑکوں پہ بہتا ٹریفک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ صبح کی کرنیں عمارتوں کے اطراف سے نکل کے سیدھی اس طرف آرہی تھیں۔

”ہمیں کسی بھی طرح وان فاتح کو پیسے کی طرف سے بے فکر نہیں ہونے دینا۔ وہ کسی سے قرضہ نہیں لے گا نہ کا کا سے کچھ مانگے گا۔ یہ گھر کروڑوں کی مالیت کا ہے۔ یہ گھر نہیں بکنا چاہیے۔“ پھر اس نے کرسی واپس موڑی۔ اب چہرے سے غصہ چھٹ چکا تھا اور اس کی جگہ گہری سوچ نے لے لی تھی۔

’مارکیٹ میں یہ خبر مشہور کر دو کہ وہ گھر haunted ہے۔ چونکہ وہ سن باؤ سے تعلق رکھتا ہے تو اس کے خریداروں چینی زیادہ دلچسپی لیں گے۔ سن باؤ چینی مسلمان تھا۔ سو کسی ایسے آسیب یا نحوست کا ذکر کرنا جو چینوں کو متاثر کرتی ہو۔“

رملی کی آنکھیں چمکیں۔ ”درست۔ ایسا ہی کرتا ہوں۔ مگر سر... یہ چوری؟“ اس نے سیف کی طرف اشارہ کیا۔

”میرا نہیں خیال کوئی چوری ہوئی ہے بہر حال سی سی ٹی وی فوٹیج چیک کرو ایک ایک فریم دیکھو۔ کوئی بھی مشتبہ شخص نظر آئے تو رپورٹ کرو۔“ وہ سختی سے تنبیہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ رملی نے جھٹ سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اشعر نے اس کی پشت کو سوچتی نگاہوں سے دیکھا۔

”کیا رملی مجھے دھوکہ دے رہا ہے؟ کہیں یہ فاتح کے ساتھ تو نہیں مل گیا؟“ اس کا ذہن دوسرے نہج پہ سوچ رہا تھا۔

یہ ایسی دنیا تھی جہاں سایے کا بھی اعتبار نہیں تھا۔

☆☆=====☆☆

سورج نکل آیا تھا۔ سڑک پہ ٹریفک رواں دواں تھی۔ آج چھٹی کا دن تھا اس لئے رش کم تھا۔ فاتح کی کار ملا کہ کے قریب ہی تھی۔ چند منٹ کا سفر ابھی باقی تھا۔

وہ سن گلاسز لگائے کہنیوں تک آستین موڑے اسٹیرنگ پہ ہاتھ رکھے ڈرائیو کر رہا تھا۔ کلائی میں پہنی بھوری گھڑی صاف نظر آ رہی تھی۔ منہ میں کچھ چبا بھی رہا تھا۔ عصرہ باہر بھاگتے درختوں اور اونچے نیچے سبز ٹیلوں کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں بچے پیچھے بیٹھے اپنے اپنے آئی پیڈز پہ لگے تھے۔ غرض سفر خاموشی سے کٹ رہا تھا۔

تبھی فاتح نے بیک ویو مرر پہ نظر ڈالی تو سکندر کے اسکرین پہ جھکے چہرے پہ غصہ دیکھا۔ فاتح نے سن گلاسز اتار کے پرے رکھے اور آئینے میں پیچھے دیکھتے اسے پکارا۔ ”سکندر... کیا تم انٹرنیٹ پہ کسی سے بحث کر رہے ہو؟“

سکندر نے چونک کے سر اٹھایا۔ عصرہ نے بھی مڑ کے دیکھا۔

”گیم کھیل رہا تھا۔“ سکندر نے خفت سے ٹیب نیچے کر لیا۔

”میں تمہارا باپ ہوں، سکندر۔ مجھے معلوم ہے تم کچھ پڑھ رہے تھے۔“

سکندر نے ناک سکوڑا۔ ”اوکے۔ میں کچھ کمئٹس پڑھ رہا تھا۔ میرے بھی کچھ فیورٹس ہیں، ڈیڈ اور مجھے برا لگتا ہے اگر لوگ ان کو برا کہیں۔“ پھر اس کے چہرے پہ بے بسی بھرا غصہ در آیا۔

”ڈیڈ لوگ اتنے بدتمیز اور پاگل کیوں ہوتے ہیں؟ کسی مشہور انسان (ایک چور نظر باپ کے کندھے پہ ڈالی) جس کو وہ جانتے تک نہیں ہوتے، اس کے خلاف اتنے برے برے کمئٹس کیسے لکھ دیتے ہیں؟“

”کس کے بارے میں کیا لکھا ہے لوگوں نے؟“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے موڑ کاٹتے ہوئے مطمئن سا پوچھ رہا تھا۔

سکندر نے ایک نظر گود میں رکھی اسکرین پہ ڈالی جس پہ وان فاتح کا ٹویٹر کھلا پڑا تھا۔ فاتح نے صبح مارٹن لوتھر کنگ کا کوئی قول پوسٹ کیا تھا اور اس پہ ہزاروں کمئٹس آئے پڑے تھے۔ مثبت کمئٹس سکندر نے صرف پڑھ کے گزار دیے تھے مگر ہر منفی پہ اس کا دل دکھتا گیا تھا۔

’بکو اس بند کرو‘ پہلے خود تو سیکھ لو‘ کرپٹ سیاستدان‘ ملک کو لوٹ کے کھا گئے ہو‘ تم سارے ملے ہوئے ہو‘ یہ وان فاتح حکومت میں آ کے وہی کرے گا جو صوفیہ رٹمن کرتی آئی ہے۔ سب کرپٹ ہیں۔ آئی ہیٹ پالیٹکس۔‘

سکندر نے چہرہ اٹھایا۔ باپ اس کے جواب کا منتظر تھا۔

’میرا ایک... ایک فیورٹ سیلبر میٹی ہے اس کے سوشل میڈیا اکاؤنٹ پہ لوگ اس پہ تنقید کر رہے ہیں۔‘

”اور اس سے تمہارا دل دکھ گیا؟“

”دکھنا نہیں چاہیے کیا، ڈیڈ؟ لوگوں کو کیا پتہ کہ وہ آدمی کون ہے میرے لئے؟“ اس کا گلارندھ گیا۔ عصرہ نے اداسی سے سر جھٹکا۔

جولیا نہ باہر دیکھتی رہی۔ سب جانتے تھے سکندر کس کی بات کر رہا تھا۔

”سکندر...“ وہ ڈرائیور کرتے ہوئے... ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”جب رسول اللہ ﷺ پہ پہلی دفعہ وحی

نازل ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو جانتے ہو کیا حکم دیا تھا؟ کہ وہ دوسروں کو بھی نیکی کی طرف بلا لیں۔ اور جانتے ہو تین سال تک

آپ ﷺ نے دوسروں کو اچھے کام کرنے کا حکم کیسے دیا؟ خاموشی سے، privately۔ چھپ کے۔ کھلم کھلا علی الاعلان نہیں۔

صرف اپنوں کو بتایا اور وہ سب مانتے گئے کیونکہ وہ اپنے تھے۔ سمجھتے تھے۔ احترام کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی سچائی سے واقف تھے۔“

سکندر ابھی تک اداسی سے اسے دیکھ رہا تھا جو نرمی سے کہے جا رہا تھا۔

”تین سال بعد رسول اللہ ﷺ نے کھلم کھلا لوگوں کو اسلام کی طرف بلانا شروع کیا۔ اور اسلام ہوتا کیا ہے؟ اچھے کاموں کی طرف بلانا۔ اور برے کاموں سے روکنا۔ جب آپ ﷺ نے یہ کام شروع کیا تو لوگوں کے آئیڈیاز چیلنج ہوئے۔ وہ جو اتنے عرصے سے جس طریقے پہ زندگی گزار رہے تھے وہ طریقہ سوالیہ نشان بن گیا۔ لوگ پھر گئے۔ دشمن بن گئے۔ رسول اللہ ﷺ کو اذیت دینے لگے۔ ابولہب کی بیوی نعوذ باللہ آپ ﷺ کو مذم‘ کہہ کے پکارنے لگی، یعنی کہ Condemned۔ جس کی مذمت کی جائے مگر جب رسول اللہ ﷺ نے یہ نام سنا تو انہوں نے کیا فرمایا؟“

سکندر نے مدد کے لئے بہن کو دیکھا جو کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی پھر واپس چہرہ موڑا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔“

”آپ ﷺ نے فرمایا‘ مذم تو میرا نام ہے ہی نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی ساری باتوں کو اس طرح انکسور کر دیا کہ یہ جب مجھے جانتی ہی نہیں ہے تو یہ جو کہہ لے یہ مجھے نہیں کہہ رہی مجھے کیا فرق پڑتا ہے؟ اسی طرح بیٹے جب بھی آپ کسی معاشرے میں reforms اور بہتری لانے کھڑے ہوتے ہو... ان کو بتاتے ہو کہ ان کا حکومت کرنے کا طریقہ یا ادارے چلانے کا طریقہ غلط ہے.... جب آپ جھوٹے کو جھوٹا اور چور کو چور کہتے ہو... تو لوگوں کے آئیڈیاز چیلنج ہوتے ہیں۔ لوگوں کو نہیں معلوم ہوتا کہ ان کو کس چیز کی ضرورت ہے حتیٰ کہ آپ ان کو ثابت کر کے نہ دکھا دیں۔ مگر اس عرصے میں ایک طبقہ جس کے مفاد اسی پرانے سسٹم کے ساتھ ہیں وہ بلبلا اٹھتا ہے۔ یہ جو صحافی تمہارے اس فیورٹ سیلیبرٹی (سکندر نے پلکیں جھکا لیں) کے خلاف روز اخبار میں لکھتے ہیں، تمہیں کیا لگتا ہے وہ اندر سے اپنے لکھے پہ خود بھی یقین رکھتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ان سب صحافیوں اور میڈیا والوں کو سب پتہ ہوتا ہے کہ کون اچھا ہے، کون کم اچھا ہے اور کون برا ہے مگر ان کے حکومت کے ساتھ مفادات ہوتے ہیں۔ بیٹے کی نوکری، کاروباری ٹھیکے، سیاستدانوں سے دوستی... بدالتوں میں کیسز.... یہ انہی وجوہات کی بنا پہ اچھے کو برا بنانے کے پیش کرتے ہیں۔ سیاست میں یہ نہ دیکھا کرو کہ کیا کہا جا رہا ہے یہ دیکھا کرو کہ کون کہہ رہا ہے۔“

”فاتح... تم سیاستدانوں کو انبیاء سے نہیں ملا سکتے۔“ عصرہ نے قدرے خفگی سے ٹوکا تھا۔

”میں ملا بھی نہیں رہا، نہ ہی ملانا چاہیے۔ لیکن انبیاء کی زندگیوں میں ہمارے لیے اسوہ حسنہ ہے۔ مشکل میں کیا کرنا ہے؟ یہ ہم نے انہی کی زندگیوں سے تو سیکھنا ہے۔ میں صرف یہ کہنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ جب بھی آپ کسی معاشرے کی اصلاح کے لئے یا کوئی بھی بڑا کام کرنے نکلیں گے، تو لوگ آپ کا مذاق اڑائیں گے۔ انبیاء کو بھی نہیں چھوڑا لوگوں نے تو ہم کیا ہیں اور تمہارا فیورٹ

سیلیئر ٹی کیا ہے۔ لوگ ہمیں نہیں بتا سکتے کہ ہم نے زندگی کیسے گزاری ہے۔ اس اتنا لوگوں کی باتوں کا اثر نہ لیا کرو۔“

”مگر ڈیڈ... میرے اپنے فرینڈز فیس بک پہ جب میرے فیورٹ سیلیئر یٹی کے خلاف کمنٹس کر رہے ہوتے ہیں تو میرا دل ان کا گلامروڑ دینے کا چاہتا ہے۔“

”اور میرا دل چاہتا ہے میں ان سے دوستی ختم کر لوں۔“ باہر دیکھتی جولیا نہ ادا سی سے بولی۔ وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

”بڑے ہو جاؤ سکندر... سیاستدانوں اور سیلیئر ٹیز کے پیچھے آپس کی دوستیاں اور تعلقات نہیں خراب کیے جاتے۔ لیڈر کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ کون کون ان کے لئے لڑ کے ناراض ہوا بیٹھا ہے۔ اگر بحث کرنی ہے تو آئیڈیاز پہ کرو۔ اپنے فیورٹ سیاستدانوں کو انسان سمجھ کے۔ انبیاء کے بارے میں بھی لوگ یہی کہتے تھے کہ وہ فرشتے کیوں نہیں ہیں۔ آج کے لیڈرز کے بارے میں بھی لوگ یہی چاہتے ہیں کہ وہ فرشتے ہوں۔ تم اپنے لیڈر کو انسان قبول کر لو۔ اس کی خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ۔ مگر اس کے جرائم کے ساتھ نہیں۔ ذاتی خامیاں سب میں ہوتی ہیں لیکن اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ سیاستدان اپنے ملک کے لوگوں کو اپنی چوری کی وجہ سے نقصان پہنچا چکا ہے اور سیاستدان بس اسی طرح ہی نقصان پہنچا سکتا ہے نا، تو تم اس سیاستدان کو قبول مت کرو۔ اس کو ڈیفینڈ مت کرو۔ باقی تمہیں کوئی بھی پرفیکٹ نہیں ملے گا۔ اگر تم اپنے لیڈر کو اس کی imperfections کے ساتھ قبول کر لو اور اس کو فرشتہ ثابت کرنے کی کوشش نہ کرو، تو تمہیں ہر وقت دوستوں سے لڑنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔“

”مگر ڈیڈ... دوست جب برے کمنٹس دیں تو میرا دل دکھتا ہے۔“ سکندر بضد تھا۔

”پھر اپنے دل کو مضبوط کرو اور ہر ایک سے یہ توقع رکھنا چھوڑ دو کہ وہ تمہاری بات سمجھے گا۔ ہر بات ہر ایک کے لئے نہیں ہوتی۔ جیسے شروع کے تین سال رسول اللہ ﷺ نے ہر ایک کو نصیحت نہیں کی، اس لئے تم بھی ہر ایک سے الجھنا چھوڑ دو۔ کچھ وقت گزرتا ہے، معاشرے بدلتے ہیں، لوگ بدلتے ہیں اور خود ہی سمجھ جاتے ہیں کہ ان کے لیے کون سا لیڈر بہتر ہے اور جو نہیں سمجھتے وہ خود ہی پیچھے رہ جاتے ہیں۔“

”مگر ڈیڈ...“

”سکندر... اللہ الحق ہے... سچ کا خدا ہے۔ اگر تمہارا فیورٹ سیلیئر یٹی سچا ہے تو اللہ ساری دنیا کو اس کی سچائی دکھا دے گا۔ سچ اپنے آپ کو خود ثابت کر لیتا ہے۔ لوگوں کی مخالفت کو وقار کے ساتھ اگنور کرنا ایک آرٹ ہے۔ اس کو جو سیکھ لیتا ہے اللہ اس کو عزت دیتا ہے۔“

وہ زور دے کر مگر نرمی سے کہہ رہا تھا۔ سکندر نے سر ہلایا۔ وہ اب بہتر محسوس کر رہا تھا مگر مطمئن بہر حال نہیں تھا۔ مطمئن رہنا بھی شاید ایک آرٹ تھا۔

کار ملاکہ کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ ملاکہ ایک خوبصورت شہر تھا جو سمندر کنارے واقع تھا اور جہاں سیاحوں کی بہتات تھی۔ تاریخی طرز کا شہر جو لوگ پیدل گھوم پھر کے دیکھا کرتے تھے۔ بازار سے کار گزار تے ہوئے فاتح کے چہرے پہ مانوس مسکراہٹ بکھر گئی۔

بالآخر وہ اس ٹھنڈی میٹھی سڑک پہ آ گئے تھے جہاں قطار میں ایک جیسے گھر بنے تھے جن کو رینووئیٹ کر کے کافی شاپس اور ریسٹوران بنا دیا گیا تھا۔ کبھی یہ چینی تاجروں کا مسکن ہوتے تھے۔ اور یہ رہا اس کا گھر... اس نے کار سڑک کنارے پارک کی اور مسکراتے ہوئے ہیلٹ کھولی، پھر باہر نکلا....

سامنے سڑک کے اوپر ایک گھر بنا تھا۔ سرخ رنگ کا گھر (جیسے پرانے لاہور کی گلیوں میں قدیم ہندوستانی طرز کے گھر ہوتے ہیں جن کی کھڑکیاں سڑک پہ کھلتی ہیں)۔ ایسا ہی وہ دو منزلہ گھر تھا۔ وہ سڑک سے ہی شروع ہوتا تھا۔ نیچے دو کمروں کی کھڑکیاں درمیان میں داخلی دروازہ۔ فاتح نے گردن اٹھائی۔ اوپر تین کمروں کی بالکونیاں بنی تھیں۔ خاموش پڑا خوبصورت گھر جس سے قدیم زمانوں کی مہک آتی تھی۔

”چلو آؤ... میں تم لوگوں کو سن باؤ کی کہانی سناتا ہوں۔“ وہ خوشگوار انداز میں کہتے ہوئے کار کی طرف مڑا جہاں بچے اور عصرہ باہر نکل رہے تھے مگر اگلے ہی لمحے فاتح کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

چند فٹ کے فاصلے پہ ایک سلور کار پارک تھی اور اس کے بونٹ سے ٹیک لگائے وہ کھڑی تھی۔ سر پہ سفید ہیٹ ترچھا رکھے وہ مسکرا کے سینے پہ بازو پیٹے ان کو دیکھ رہی تھی۔

”آنے کے لئے شکریہ تالیہ۔“ عصرہ سیدھی اس کی طرف گئی اور مسکرا کے اس سے ہاتھ ملایا۔ پھر واپس گھومی اور فاتحانہ مسکراتی نگاہوں سے فاتح کو دیکھا۔ ”تالیہ سن باؤ کا گھر دیکھنا چاہتی تھی تو میں نے اسے انوائٹ کر لیا۔ امید ہے اس بہانے ہم اپنے نیلامی کے پراجیکٹ پہ بھی بات کر لیں گے۔“ جتنا تے انداز میں بات مکمل کی۔

وان فاتح نے لب بھنج لئے۔ ابرو برہمی سے اکٹھے ہوئے۔ ایک خاموش، چبھتی ہوئی نظر اس لڑکی پہ ڈالی جو سادگی سے مسکرا رہی تھی اور گھر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس کا سارا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ جانے وہ اتنی بری کیوں لگتی تھی؟

☆☆=====☆☆

کوالا لپور کے اس متوسط طبقے کے علاقے میں صبح سست سی طلوع ہوئی تھی۔ کم از کم ایڈم کے لئے وہ سست ہی تھی۔ وہ ڈھیلا ڈھیلا سا کچن میں کرسی پہ بیٹھا تھا۔ ناشتہ میز پہ لگا تھا مگر وہ بمشکل چند لقمے زہر مار کر پایا تھا۔ پھر پلیٹ پرے دھکیل دی۔

ماں سامنے کھڑی بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ ”نوکری کے لئے پریشان ہو، ایڈم؟“

ایڈم نے افسردہ نگاہیں اٹھائیں۔ ”مجھے لگتا ہے میں ناکام انسان ہوں، ایبو۔“

”کیوں ایڈم؟“ اس نے پیار سے پوچھا اور سامنے آ بیٹھی۔ اسکارف لپیٹے سادہ سی عورت جس کی چھوٹی سی دنیا تھی۔

”سب مجھے دھوکہ دے کر ٹھکرا کے گزر جاتے ہیں۔ کسی کی نظر میں میری اہمیت ہی نہیں ہے۔“

”اہمیت تو خود بنائی جاتی ہے۔“

”کیسے؟ ذہانت، مہارت، ٹیلنٹ، دولت وغیرہ سے؟“ وہ تلخی سے گویا ہوا۔

”نہیں۔ اپنے قدرتی اعتماد اور مثبت سوچ سے۔ جتنا تمہارے اندر سے مثبت شعائیں پھوٹیں گی، اتنا تم لوگوں میں محبوب ہوتے

جاؤ گے۔“

”اور مثبت شعائیں کیسے پھوٹتی ہیں، ماں؟“

”جب تم سچ بولو اور دوسروں سے توقعات لگانا چھوڑ دو۔ نروپے پیسے کی، نہ توجہ اور محبت کی۔ جو لوگوں کے پاس ہے، اس کا لالچ

چھوڑ دو۔ لوگ تمہارے گرد ویدہ ہو جائیں گے۔ لوگوں کو اپنی محبت میں گرفتار کروانے کا ایک یہی کلیہ ہے۔“

”مجھے نہیں پتہ۔“ اس نے اداسی سے سر جھکا لیا۔ ”میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہر کوئی مجھے بے وقوف بنا کے آگے نہ بڑھ جایا

کرے۔“

”کس نے بنایا ہے تمہیں بے وقوف؟“

”چپے تالیہ نے۔ وہ مجھ سے جھوٹ بول رہی ہیں۔“ وہ خفگی سے تیز تیز بولنے لگا۔ ”وہ کبھی کچھ کہتی ہیں، کبھی کچھ۔ کبھی وہ مجھے

اچھی لگتی ہے اور کبھی بالکل ناقابل اعتبار۔“

”اس نے اس دن بھری محفل میں تمہاری حمایت کی تھی۔“

”کہانا، کبھی اچھی بھی لگتی ہے!“ اس نے منہ بسورا۔

”تویری کب اور کیوں لگتی ہے؟ کس بات نے تمہیں اس سے بدظن کیا؟“

ایڈم اس بات پہ چونکا۔ ذہن میں بجلی کی طرح کوئی خیال کوندا تھا۔ جیسے ایک پانی کی لہری آتی ہے اور سارے جالوں کو بہا لے

جاتی ہے، پھر پیچھے ذہن بالکل صاف ہو جاتا ہے۔

اس ایک لمحے میں ایڈم پہ آشکار ہوا کہ وہ اسے ناقابل اعتبار کب سے لگنے لگی تھی۔

”پمبورو!“ وہ بڑبڑایا۔ ماں نے نا سنجھی سے اسے دیکھا۔ ”پمبورو کون؟“

”اُف ایبو۔ تم کتابیں نہیں پڑھتیں کیا؟“ وہ تیزی سے اٹھا۔ رستے میں جو کرسی میز آئی، اس سے اس نے ٹھوکر کھائی مگر رکا نہیں۔ سیدھا کمرے کی طرف بھاگا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

بیڈ کے نیچے سے ننھا صندوق باہر کھینچا اور کھولا۔ اندر سے دھول مٹی سانس میں آئی مگر اس نے ناک پہ ہاتھ رکھ لیا۔ اتنا پر جوش تھا کہ دمہ خراب ہونے کا ڈر بھی نہیں تھا۔ صندوق میں کتابیں بھری پڑی تھیں۔ وہ جلدی جلدی ان کو الٹ پلٹ کرتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک موٹی تاریخی کتاب نکالی اور جلدی جلدی صفحے پلٹائے۔

وہ تاریخی داستانوں پر مبنی تھی اور اس میں ایک چھوٹا سا باب پمپورو (شکار باز) نام کا تھا۔ مطلوبہ صفحہ کھولا تو ایڈم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سامنے بلیک اینڈ وائٹ میں اسی نشان کا اسکیچ بنا تھا جو اس نے کل بازار میں تالیہ کی گردن کی پشت پہ دیکھا تھا۔ پمپورو گروہ کا خاص گول نشان۔

اس نے جلدی جلدی اس صفحے کو پڑھا۔ وہ شکار بازوں کا ایک قدیم گروہ تھا جو کسی خزانے کے پیچھے تھے۔ ان کو خزانہ ملا یا نہیں، خزانہ کیا تھا، وہاں کچھ نہیں لکھا تھا، بس ایک چابی کا ذکر تھا اور ساتھ میں ایک مہم سا اسکیچ بھی۔ گول سکے کی طرح کی چابی جس کے ایک کونے میں ڈلی جڑی تھی۔ مزید کوئی تفصیل اس تاریخی کتاب میں درج نہیں تھی۔ لہذا اس موضوع پہ دوسری کتابیں بھی موجود ہوں گی مگر ایڈم کے پاس ان کو پڑھنے کا وقت نہیں تھا۔ ساری کہانی ذہن میں کھلتی جا رہی تھی۔

چابی کے دو حصے تھے۔ سکہ اور یہ لمبی سی ڈلی۔ سکہ اس کے پاس تھا۔ تالیہ مراد وہ سکہ حاصل کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کی مدد سے خزانے کا قفل کھول سکے۔ خزانہ ملا کہ میں کہیں تھا کیونکہ شکار بازوں کا تعلق ملا کہ سے تھا۔ وہ کوئی پولیس آفیسر نہیں تھی۔ وہ صرف ایک ٹریڈر رہنم تھی۔

وہ کتاب رکھ کے تیزی سے الماری کی طرف لپکا۔ اندر سے ڈبیا نکالی جس میں سکہ تھا۔ وہ ٹھنڈا پڑا تھا۔ سنہری دھات دمک رہا تھا، مگر آج اس میں کوئی ہند سے نہیں ابھرے تھے۔ اس نے سکہ الٹ پلٹ کے دیکھا۔ ایک کونے میں ننھا سا سوراخ تھا۔ یہیں سے ڈلی اندر جائے گی اور وہ چابی مکمل ہو جائے گی۔

اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اگلا سوال زیادہ پریشان کن تھا۔ کوئی بھی خزانہ جو کسی بھی ملک کے کھنڈرات یا زمین کے نیچے سے نکلتا ہے، وہ سرکار کی امانت ہوتا ہے۔ یہ خزانہ درست کا تھا۔ وہ اسے تالیہ مراد کو نہیں لینے دے گا۔ اسے وان فاتح کو خبر کرنی ہوگی۔ اس نے جلدی سے ڈرائیور کا نمبر ملا یا۔ وہ اس وقت بے چینی، فکر مندی اور جوش کے ملے جلے تاثرات کے زیر اثر تھا۔

”ہیلو؟ ہاں سنو۔ وان فاتح اس وقت کہاں ہیں؟ آفس یا گھر؟“

”ہم تو ملا کہ میں ہیں ایڈم۔ فاتح صاحب کے پرانے گھر۔“

”اوہ۔“ ایڈم کا جوش ٹھنڈا ہوا۔ ”کب تک آ جاؤ گے واپس؟“

”شاید شام تک۔ معلوم نہیں۔“

”اچھا سنو... وہ تالیہ مراد صاحبہ... وہ دوبارہ تو گھر نہیں آئیں؟ اور چوری کا کچھ پتہ چلا؟“

”اس گھر تو نہیں، مگر ادھر ملا کہ میں وہ صاحب اور بیگم صاحبہ کے ساتھ ہی ہیں۔ وہ لوگ اندر گھر دیکھ رہے ہیں۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

ایڈم کرنٹ کھا کے جگہ سے اٹھا۔ ”چے تالیہ صاحب کے ساتھ ملا کہ میں ہیں؟“ پھر اسے یاد آیا۔ کتنی دفعہ کاسن رکھانا م۔ ”سن باؤ کے گھر میں؟“ بے یقینی سے پوچھا۔

”ہاں مگر تم کیوں...“

لیکن ایڈم نے فون کاٹ دیا۔ دماغ کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ سن باؤ کا گھر... تین خزانوں والا گھر... کیا چے تالیہ وہاں خزانے کی تلاش میں گئی ہیں؟ کیا یہ ممکن تھا کہ خزانہ اسی گھر میں چھپا ہو؟ اوہ نو... اسے وان فاتح کو بتانا تھا۔

اس نے جلدی سے الماری کھولی، جو جوڑا ہاتھ آیا، کھینچ نکالا اور باتھ روم کی طرف بھاگا۔

آدھے گھنٹے بعد ایڈم ملا کہ جانے والی ایک بس میں سوار ہو رہا تھا۔ سکے اس کے لباس کی اندرونی جیب میں محفوظ رکھا تھا۔

☆☆=====☆☆

وہ کوالا پور کی ایک خوبصورت سوسائٹی تھی۔ ایک طرف مکان قطار سے بنے تھے اور ان کے آگے سڑک پہ ٹریفک بہہ رہا تھا۔ ایسے میں ایک گھر کا دروازہ لاک کر کے سمج باہر نکلا اور سڑک کنارے چلنے لگا۔ ٹراؤز پر پرف سی شرٹ پہنے وہ منہ میں کچھ چباتا، چھٹی والے دن گرومیری لانے والے مردوں میں سے ایک لگ رہا تھا۔

اسے قریبی گرومیری اسٹور پہ جانا تھا۔ جیسے ہی اسٹور سامنے آیا وہ اس کے دروازے کے قریب آیا مگر راستے میں کوئی رکاوٹ کی طرح حائل ہوا تھا۔ یا شاید کسی پہاڑ کی طرح۔

وہ سیاہ کھلے بلاؤز اسکرٹ والی موٹی سی عورت تھی۔ سیاہ رنگت اور گھنگریالے کندھوں تک آتے سیاہ بال۔ وہ اس کو گھورے جا رہی تھی۔ پر تیش تیز نگاہوں سے۔

سمج کی پیشانی پہ بل پڑے۔ ”کیا ہے؟ ہٹو سامنے سے۔“

”تالیہ کا پیچھا چھوڑ دو۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کے بولی۔ آنکھوں کی تپش کی نسبت الفاظ ٹھنڈے تھے۔

سمج کے دونوں ابرو استہزائیہ انداز میں اٹھے اور لب مسکراہٹ میں ڈھلتے گئے۔

”اوہ... تو تمہیں تالیہ نے بھیجا ہے۔“

”میں کہہ رہی ہوں اس کا پیچھا چھوڑ دو۔ وہ میری حفاظت میں ہے۔“

سمیچ چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر زور سے ہنس دیا۔ داتن اسی طرح اسے گھورے گئی۔

”تو تالیہ نے اپنی باڈی گارڈ بھیجی ہے اور کیا ہی اعلیٰ باڈی گارڈ بھیجی ہے۔ واہ۔ اپنی جان بچانے کے لئے دو کوس تک تو تم سے

بھاگا نہیں جائے گا بی اور تم آئی ہو مجھے دھمکانے۔ واہ۔“ وہ ہنستے ہوئے سر جھٹک رہا تھا۔

”تالیہ میری بیٹی ہے۔ اور بہن بھی۔ اور دوست بھی۔ کبھی کبھی وہ میری ماں بھی بن جاتی ہے۔ وہ میرے لئے ایسی ہے کہ میں

اس کے نزدیک تم جیسے کچرے کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لئے تمہیں مجھ سے ڈرنا چاہیے اور اس سے دور رہنا چاہیے کیونکہ میں ایک

بہت خطرناک عورت ہوں۔“

سمیچ نے طنزیہ مسکراتے ہوئے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ”اور تم کیا کرو گی؟“

”میں تمہارا سانس بھی روک سکتی ہوں، سمیچ!“ وہ اسی طرح اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ مگر سمیچ نہیں ڈرا۔ اس موٹی عورت

سے کون ڈر سکتا تھا جو ایک ہاتھ میں چاکلیٹس اور رنگ برنگے چپس کے پیکٹ اٹھائے ہوئے کھڑی تھی۔ اُف۔ بے چاری۔

”اگر تمہاری جگہ کوئی مرد ہوتا تو میں اس کو ہاتھوں کی زبان میں سمجھاتا، لیکن تم عورت ہو، اور بے شک دو تین عورتوں کے برابر ہو،

لیکن مجھے تم پہ ترس آ گیا ہے۔ سو... تمہارے لئے... اتنا ہی کافی ہے...“ کہہ کے وہ گھوما اور سڑک سے گزرتی پولیس کی کار کو اشارہ

کرتے ہوئے چلایا۔ ”آفیسر... آفیسر۔“ یہاں جگہ جگہ پولیس کی پٹرول کار زگھوم رہی ہوتی تھیں۔ پولیس اہلکار نے فوراً کاررو کی اور

اپنا پستول نکالتا ہر نکلا۔

”کیا ہوا، سر؟“ باوردی آفیسر تیزی سے اس کی طرف آ رہا تھا۔ سمیچ نے خاموش کھڑی داتن کا بازو کہنی سے پکڑ لیا، اور چہرے پہ

بے پناہ پریشانی طاری کر لی۔

”یہ عورت میرا بوہ چرا رہی تھی، پلیز اس کی تلاشی لیں، یہ...“ دکھی اور پریشان انداز میں اس نے بات شروع ہی کی تھی کہ....

”مسز لیانہ... آپ...“ آفیسر پستول ہاتھ میں لئے قریب آیا اور لیانہ کا چہرہ دیکھ کے خوشگوار حیرت سے مسکرایا۔ ”کیسی ہیں آپ

؟“ پھر سمیچ کی طرف دیکھا۔ ”سب ٹھیک ہے، میم؟“

سمیچ کے الفاظ منہ میں رہ گئے تھے۔ اس نے رک کے باری باری دونوں کے چہروں کو دیکھا۔ موٹی عورت بالآخر مسکرائی۔ اور

نرمی سے اپنی کہنی چھڑائی۔

”ہاں... سب ٹھیک ہے... یہ ہمارا دوست ہے... سمیچ... سا منضوالی اسٹریٹ میں مکان نمبر 26 اے میں رہتا ہے۔ تم آتے

جاتے اس کو دیکھنا تو اس کا خیال رکھنا ہوں۔“

”ہاں شیور۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ پرسوں زید کی برتھ ڈے پہ آرہی ہیں نا آپ؟“ وہ مسکرا کے ادب سے پوچھ رہا تھا۔

”تمہارے بیٹے کی سالگرہ ہو اور میں نہ آؤں، ایسا ہو سکتا ہے فیاض؟“ وہ ہاتھ جھلا کے بولی تو آفیسر ہلکا سا ہنس دیا، پھر خوش اخلاقی سے دونوں کو سلام کیا اور گن ہولسٹر میں اڑستا، کار کی طرف بڑھ گیا۔

داتن اب فرصت سے سمج کی طرف گھومی جس کے چہرے کے تاثرات بدل چکے تھے۔ وہ قدرے شل قدرے چوکنا لگتا تھا۔

”اب میں دوبارہ وہ تمام الفاظ دہراؤں گی جو میں نے ابھی کہے۔ لیکن امید ہے اس دفعہ تم ان کو غور سے سنو گے۔“ وہ اس کو گھورتے چباچبا کے بولنے لگی۔

”تالیہ کا پیچھا چھوڑ دو۔ میں کہہ رہی ہوں سمج... اس کا... پیچھا چھوڑ دو۔“ وہ ایک ایک قدم آگے بڑھنے لگی اور سمج ایک ایک قدم پیچھے ہٹنے لگا۔

”وہ میری حفاظت میں ہے... وہ میری بیٹی بھی ہے، بہن بھی اور دوست بھی... اور کبھی کبھی....“ وہ قریب آرہی تھی اور سمج شل چہرے کے ساتھ پیچھے ہٹ رہا تھا۔

”وہ میری.... ماں بھی بن جاتی ہے۔ وہ میرے لئے ایسی ہے کہ اس کے نزدیک.... میں تم جیسے کچرے کو... برداشت بھی نہیں کر سکتی....“ اسٹور کی بیرونی دیوار سے سمج کی کمر ٹکرائی.... وہ مزید پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا.... نہ اس کے ہاتھ میں پستول تک رینگ جانے کی سکت تھی۔ داتن مزید قریب آئی۔ وہ اس کے سیاہ چہرے کا ایک ایک نقش دیکھ سکتا تھا۔

”اس لئے.... تمہیں مجھ سے.... ڈرنا چاہیے.... اور تالیہ سے.... دور رہنا چاہیے.... کیونکہ.... میں.... ایک بہت.... خطرناک عورت ہوں... اور میں تمہارا.... سانس بھی روک سکتی ہوں، سمج!“ اس کے بالکل قریب آ کے وہ غرائی۔ وہ چپ، شل کھڑا رہا۔ پھر وہ مڑی اور اسٹور کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد سمج نے نظر اٹھا کے دیکھا۔

بھاری بھر کم عورت اب کینڈیز اور بچوں والی جلیز کے ریک کے ساتھ جا کھڑی ہوئی تھی اور مختلف پیکٹ اٹھا کے دیکھ رہی تھی۔ سمج ہنوز ساکت کھڑا تھا۔

☆☆=====☆☆

ملا کہ پہ دو پہر پھیل رہی تھی۔ فضا نرم آلود تھی۔ دور سمندر کی لہروں کا شور یہاں تک سنائی دے رہا تھا۔ بازار میں معمول کی گہما گہمی تھی۔ ٹریفک، دکانداروں کا شور اور آوازیں۔ ایسے میں سرخ گھر کے اندر آؤ تو بڑے کمرے سے گزر کے صحن آتا تھا۔ وہاں تالیہ گردن اونچی اٹھائے کھڑی بالائی منزل کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں بچے ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔

اندر ایک کمرے کا دروازہ بند کیے وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ فاتح دونوں ہاتھ کمر پہ جمائے سخت ناخوش لگ رہا تھا۔
 ”اس لڑکی کو بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ ہمارا فیملی ہالیڈے تھا۔“

”کون سی فیملی؟ جس کو تو تم اپنی سیاست کے پیچھے چھوڑنے تک تیار ہو گئے تھے؟ اگر صرف سیاست ہی میسر کرتی ہے فاتح تو میں بھی وہی کر رہی ہوں۔ وہ میرا بزنس انٹر سٹ ہے اور جیسے میں تمہارے مفادات میں تمہارا ساتھ دیتی ہوں تم بھی دو گے!“
 ”اس نے ہمارے گھر سے چوری کی ہے عصرہ!“ لیکن عصرہ نے درشتی سے بات کاٹی۔

”مگر تمہاری فائل تو کھوئی ہی نہیں ہے فاتح۔ اور اگر کی بھی ہے تو کیا ہوا۔ کیا بار سین نیشنل میں کرپٹ سیاستدان نہیں ہیں جن کے ساتھ تم روز اٹھتے بیٹھتے ہو اور میں ان کی دعوتیں کرتی ہوں۔ جیسے ان چوروں کو میں برداشت کرتی ہوں میری چور کلائنٹ کو تم کرو گے۔“

فاتح نے لب بھنج لیے اور چہرہ موڑ لیا۔ اس کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

”ویسے بھی ابھی تم یہی کہہ رہے تھے نا کہ سیاستدانوں کے پیچھے دوستوں کو آپس کے تعلقات نہیں خراب کرنے چاہئیں۔“ تلخی سے کہہ کے وہ تیز تیز آگے بڑھ گئی۔

تالیہ ابھی تک دالان میں کھڑی گردن اٹھائے گھر کے بالائی کمروں کو دیکھ رہی تھی جب دھیرے دھیرے سارے گھر والے اسی طرف آتے گئے۔ بچے عصرہ اور پھر ان کے پیچھے فاتح بھی۔ وہ بٹنوں والی سفید شرٹ کے آستین موڑے جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے قدم اٹھاتا قریب آیا تو تالیہ نے گردن موڑی۔ وہ نارمل لگ رہا تھا۔ ٹھنڈا۔ پرسکون۔ بے نیاز۔ بزنس فیس۔

”اس گھر کو سن باؤ کا گھر کیوں کہتے ہیں فاتح صاحب؟“ وہ سادگی سے اسے دیکھ کے بولی تو فاتح نے رخ موڑ لیا اور آگے چلتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ صحن کے دوسرے کونے میں نصب اونچے چبوترے تک جا ٹھہرا جس کے اوپر ایک مجسمہ نصب تھا۔

”یہ دوانگ لی کا مجسمہ ہے۔“ اس نے مجسمے کی طرف اشارہ کیا۔ دھوپ آج نہیں تھی۔ موسم ٹھنڈا اور نرم آلود تھا۔ ہر سو چھایا سی تھی۔ ایسے میں سرخ اینٹوں سے بنے صحن میں وہ سرمئی اونچا مجسمہ بہت حسین لگ رہا تھا۔ ایک چینی آدمی پورے قد سے کھڑا تھا۔ کمر پہ ہاتھ باندھے۔ لمبے بال سر پہ ٹوپی لمبی باریک مونچھیں... اور کندھوں سے پیر تک گرتا چغہ۔ میان میں تلوار۔ چہرے پہ دوستانہ مسکراہٹ۔

تالیہ دھیرے دھیرے چلتی قریب آئی۔

”اور دوانگ لی کو سن باؤ کیوں کہتے تھے ڈیڈ؟“ سکندر بھی باپ کے پاس آکا۔

”سن باؤ.... یعنی تین خزانے یا تین نگینے۔ بدھ مت کے تین نگینے ہوتے ہیں بدھا، دھما، سنگھا۔ ان کو سن باؤ کہا جاتا ہے۔“

وانگ لی ایک چینی غلام تھا پندرہویں صدی میں وہ اپنی ذہانت اور صلاحیت کے بل بوتے پہ کم عمری میں ہی محل میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیتا ہے۔ پھر چینی بادشاہ کا خاص سفیر مقرر ہوتا ہے اور ایک بہت بڑا تاجر بن جاتا ہے۔ وہ کمر پہ ہاتھ باندھے کھڑا گردن اٹھا کے مجسمے کو دیکھتا بتا رہا تھا۔ تالیہ کے آنے کی کلفت بے زاری۔ وہ سب بھول گیا تھا۔

”اس کو بادشاہ نے سن باؤ کا لقب عطا کیا تھا۔ وہ اکثر ملا کہ آتا تھا ساری دنیا سے گھوم پھر کے سامان تجارت اور مختلف حکومتوں سے معاہدے کر کے وہ سمندر کے راستے ملا کہ آتا۔ اس نے اور دوسرے تاجروں نے یہاں ویرہاؤ سز بنائے تھے۔ یہ گھر وانگ لی نے بنوایا تھا۔ یہاں وہ سامان وغیرہ رکھتا اور خود بھی رہا کرتا تھا۔ اپنے آخری قیام میں وہ کافی عرصہ ادھر رہا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کا ایکسپلورر تاجر اور ایڈمرل تھا۔ اس نے چینی حکومت کو دنیا کی بہترین سپر پاورز میں سے بنادیا تھا۔ کہتے ہیں وہ کمال کا آدمی تھا۔“

”آپ کے والد نے وانگ لی کا گھر کیوں خریدا؟“ وہ فاتح کے چہرہ کو دیکھ رہی تھی جو ابھی تک اس مجسمے کو دیکھ رہا تھا۔ جولیاناہ درختوں کے پتوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی اور عصرہ اندر کمروں کی طرف چلی گئی تھی تاکہ گھر کی مرمت کے کام کا جائزہ لے سکے۔

”میں چھوٹا تھا تو ایک دفعہ یہاں آیا تھا۔ تب کسی کو نہیں معلوم تھا کہ یہ وانگ لی کا گھر ہے۔ میں باپا کے ساتھ سامنے کسی دکان پہ بیٹھا تھا پھر ادھر آ گیا۔ یہ مجسمہ... تب یہ یوٹا چھوٹا تھا عصرہ نے بعد میں اس کو ٹھیک کروایا یہ مجسمہ مجھے بہت پسند آیا تھا۔ عجیب کشش تھی اس میں۔ اب بھی ہے۔ مانوسیت۔ اپنائیت۔ جیسے کوئی دوست ہوتا ہے نا۔“ اس کی گردن اٹھی تھی اور وہ مسرر رہا تھا۔ ہاتھ ایسے کمر پہ باندھ رکھے تھے جیسے وانگ لی نے باندھے ہوئے تھے۔

”کس نے بنایا تھا یہ مجسمہ؟“ سکندر نے دلچسپی سے پوچھا۔

”شہزادی تاشہ نے!“

تالیہ چونک کے اسے دیکھنے لگی۔ ”شہزادی تاشہ کون تھی؟ یونو میں نے بھی ایک دفعہ ایک تھیٹر شو میں تاشہ آ گا پووا کا کردار کیا تھا۔“ وہ آریاناہ کو بہت پسند تھی۔ ”سکندر فور ابولا مگر فاتح نے چہرہ موڑ کے قدرے خفگی سے اسے دیکھا۔ ”وہ کوئی روسی فیری ٹیل تھی جو

دس سال پہلے لکھی گئی تھی۔ میں ملا کہ سلطنت کی شہزادی تاشہ کی بات کر رہا ہوں۔“ پھر دوبارہ سے مجسمے کو گردن اٹھا کے دیکھنے لگا۔ ”تو کون تھی شہزادی تاشہ؟“ تالیہ کی نظریں بے اختیار دیوار کی جانب اٹھیں۔ شمالی دیوار جہاں اس نے وہ نظم لکھی دیکھی تھی۔ خواب کے برعکس وہ دیوار خستہ حال نہیں تھی۔ شاید رینوویشن میں مرمت کر دی گئی تھی۔ وہاں کسی بھی قسم کی لکھائی کا نشان نہیں تھا۔

”شہزادی تاشہ فاتح کے پسندیدہ کرداروں میں سے ہے۔“ عصرہ باہر آتے ہوئے محظوظ انداز میں بولی۔ ”فاتح کسی عورت کی تب تک تعریف نہیں کرتا جب تک وہ اس کی شدید مستحق نہ ہو مگر شہزادی تاشہ سے وہ ہمیشہ متاثر رہا ہے۔“

وہ مسکرا کے پلٹا۔ ”میں اکثر تمہاری تعریف کرتا ہوں۔“

عصرہ نے مسکرا کے شانے اچکائے اور پھر تالیہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”شہزادی تاشہ ملا کہ کی سب سے حسین شہزادی تھی۔ وہ سلطان کی بیٹی نہیں تھی بلکہ بندہارا کی بیٹی تھی۔“

”بندہارا کیا ہوتا ہے، ماما؟“

”وہی جو تمہارے باپا بننا چاہتے ہیں۔ پردھان منتری۔ وزیر اعظم۔ اس زمانے میں سب سے طاقتور بادشاہ ہوتا تھا اور اس کے بعد وزیر اعظم۔ مگر آج کے ملائیشیاء میں وزیر اعظم سب سے طاقتور ہوتا ہے اور اس کے بعد بادشاہ۔“

”تھینکس ٹو ڈیمو کریسی!“ وہ واپس جیبوں میں ہاتھ ڈالے آگے چلتا گیا۔ صحن کے دوسرے کونے میں درخت لگے تھے جو اس کے باپا نے لگوائے تھے۔ جولیانہ وہیں بیٹھی تھی۔ وہ جھک کے اس کو سرگوشی میں کچھ کہنے لگا اور وہ دبا دبا سا ہنسنے لگی۔ تالیہ نے ان سے نظر ہٹائی اور عصرہ کی طرف متوجہ ہوئی جو بتا رہی تھی۔

”شہزادی تاشہ کے بارے میں Malay annals میں کوئی ذکر نہیں ملتا لیکن چند دوسری تاریخی کتابوں میں تھوڑا بہت ضرور لکھا ہے۔ وہ پردھان منتری کی بیٹی تھی۔ بے حد ذہین، عقلمند اور دانا۔ کہتے ہیں وہ سب کچھ کر سکتی تھی۔ عورتوں والے کام بھی مردوں والے کام بھی۔ گھڑ سواری، تیر اندازی، تلوار زنی ہو یا پھر کھانا پکانا، کڑھائی سلائی، لکھنا پڑھنا غرض تاشہ کسی ساحرہ کی طرح تھی۔ اسے کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ وہ سیاسی سمجھ بوجھ بھی رکھتی تھی اور اپنے باپ اور سلطان تک کو سیاسی مشورے بھی دیتی تھی۔ ایک وقت میں وہ اتنی طاقتور تھی کہ مورخ لکھتے ہیں، وہ سارے محل کو چلا رہی تھی۔ کہتے ہیں سلطان بھی اس سے بہت متاثر تھا اور اس کو اپنے لئے چاہتا تھا۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”معلوم نہیں۔ کہتے ہیں اس کی کہانی کا انجام دکھی تھا۔ مگر وہ اکثر سن باؤ کے گھر آیا کرتی تھی۔ یہاں اسی آنگن میں۔ اسی نے یہ مجسمہ بنایا تھا۔ کہتے ہیں سن باؤ سے اس کی دوستی تھی۔ یا معلوم نہیں کیا تھا جو وہ اس گھر میں اکثر آتی تھی۔“ عصرہ نے آخر میں گہری سانس لے کر شانے اچکا دیے۔ پھر گردن موڑی اور سامنے والے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ سن باؤ کا کمرہ تھا۔ وہ یہاں انگلیٹھی کے پاس بیٹھا کرتا تھا اور وہ ادھر دالان میں کھڑے مجسمہ بناتی تھی۔ بالکل ادھر جہاں تم کھڑی ہو۔“

تالیہ ایڑھیوں پہ الٹی گھومی۔ اب اس کے سامنے سن باؤ کا کمرہ تھا اور اوپر... اس نے نگاہیں اٹھائیں۔ اوپر تین کمرے تھے جن کی بالکونیاں سڑک کی طرف بھی کھلتی تھیں اور ایک ایک کھڑکی ادھر صحن میں بھی کھلتی تھی۔

”اوپر کون رہتا تھا؟“ وہ سوچتی نظروں سے بولی۔

”اوپر؟“ عصرہ نے اچنبھے سے اوپر دیکھا۔ ”شاید سامان وغیرہ رکھا جاتا ہو کیونکہ سن باؤ کا کوئی خاندان تو تھا نہیں۔ وہ غلام تھا

نا!“ (غلام شادی سے معذور ہوتے تھے۔)

”اس جگہ سے کھڑے ہو کر سن باؤ کا کمرہ اتنا صاف نہیں دکھتا جتنا اوپر والا کمرہ دکھتا ہے۔“

وہ اوپر دیکھتی بے خودی کے عالم میں کہے جا رہی تھی۔ ”شاید کوئی سن باؤ کے ساتھ رہتا تھا یہاں۔ شہزادی ایک محل سرا سے ملنے نہیں آتی تھی۔ شاید وہ اس سے ملنے آتی تھی جو اوپر اس کمرے میں رہتا تھا....“

فاتح جو ابھی تک جولیا نہ سے جھک کے کچھ کہہ رہا تھا اس بات پہ چونک کے پلٹا اور سیدھا ہوا۔

”یہ میرا کمرہ ہے۔“

تالیہ اسے دیکھ کے اداسی سے مسکرائی۔ ”شاید اس کمرے کے مکین کو بھی شہزادی تا شاہ اتنی ہی پسند ہو جتنی آپ کو ہے۔“ اور آگے بڑھ گئی۔ فاتح نے چند لمحے اس کی بات پہ غور کیا پھر بیٹی کی طرف واپس مڑ گیا۔ عصرہ سیل فون سے تصویریں بنا رہی تھی اور سکندر مجسمے کے قدموں میں بیٹھا اس پہ غور کر رہا تھا۔

تالیہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی صحن کے دوسرے کونے میں بنے کنویں تک آئی۔

قدیم طرز کا کنواں جو کسی زمانے میں سن باؤ کے زیر استعمال تھا۔ وہ کنویں کے سر پہ رکی اور اندر جھانکا۔ پھر مڑ کے دیکھا۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

تالیہ نے جیب سے لائٹ نکالی اور اس کی نیلی روشنی کنویں کے اندھیروں کی سمت پھینکی۔

کنویں کی ایک دیوار کے ساتھ دھبے سے لگے تھے جو نیچے گہرائی میں اتر رہے تھے۔ وہ مزید آگے ہوئی۔ وہ دیوار میں کھدے ننھے ننھے سے زینے تھے جن کی مدد سے نیچے اتر جاسکتا تھا۔

نیچے کیا تھا؟

تالیہ مراد مسکرائی اور لائٹ بند کی۔ اسے معلوم تھا خزانہ کہاں ہے۔

پھر وہ مڑی اور اعلانیہ انداز میں اونچا سا بولی۔

”تو اٹکو.... میں یہ گھر خریدنا چاہتی ہوں۔“

☆☆=====☆☆

حالم از نمرہ احمد کی چھٹی قسط 1 ستمبر کو پیش کی جائے گی۔